تہذیبِ جدید اور اقبال

ڈاکٹر رضوان احمد مجاہد

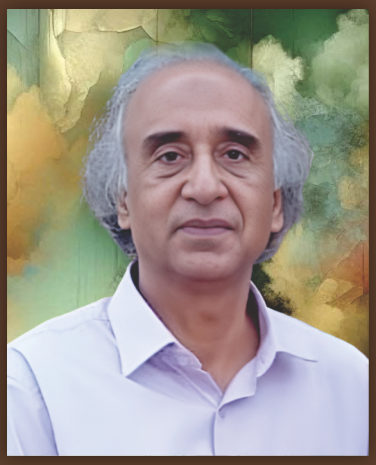

علم وفکر کی روایت میں بعض تصانیف ایسی ہوتی ہیں جو محض معلومات کی فراہمی پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ قاری کے ذہن میں سوالات کی نئی دنیا آباد کرتی، زاویۂ نگاہ کو وسعت دیتی اور فکری بالیدگی کے در وا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر رضوان احمد مجاہد کی تصنیف ''تہذیبِ جدید اور اقبال'' اسی نوعیت کی ایک سنجیدہ، بامقصد اور فکری طور پر توانا کاوش ہے۔ مصنف نے عرق ریزی، تحقیقی دیانت اور فکری توازن کے ساتھ اپنے موضوع کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ محض خواندگی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ سنجیدہ غور و فکر کے لیے مہمیز بن جاتا ہے

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

دانائے راز، حکیم الامت، شاعرِ مشرق، مصورِ پاکستان، علامہ محمد اقبالؒ وہ عظیم ہستی ہیں جن کے فکر و فن پر گذشتہ ایک صدی میں دیگر فلاسفہ و ادبائے مشرق کے مقابلے میں بلا مبالغہ سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود اقبال شناسی کی یہ روایت آج بھی جاری و ساری ہے اور اہلِ قلم آج بھی فکرِ اقبال کے نئے گوشے دریافت کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر رضوان احمد مجاہد کی یہ تصنیف ان توضیحی و تفسیری کاوشوں میں عمدہ اضافہ ہے۔

ڈاکٹر فیصل کمال حیدری

تہذیبِ جدید اور اقبال

ڈاکٹر رضوان احمد مجاہد

کارواں Publications Lahore

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	تہذیب جدید اور اقبال
مصنف	ڈاکٹر رضوان احمد مجاہد
اشاعت اوّل	جنوری 2026ء
سرورق	شرجیل ظفر
مطبع	الاشراق پرنٹنگ ایجنسی، لاہور
قیمت	۱۰۰۰ روپے
بیرونِ ملک	10 ڈالر

کتاب ملنے کا پتہ

03009488525

dr.rizwanmujahid92@gmail.com

کاروان پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان

انتساب

والد گرامی طلعت محمود مرحوم اور
والدہ محترمہ منور طلعت
کے نام!
جن کی
دعائے نیم شب اور آہِ سحر گاہی
میری زندگی کا اثاثہ ہے۔

ترتیب

- انتساب 3
- پیش لفظ مصنّف 5
- تقریظِ حمید ڈاکٹر طاہر حمید تنولی 8
- تقدیم ڈاکٹر فیصل کمال حیدری 10

باب اوّل ○ مغربی تہذیب: پس منظر و خصائص 15

باب دوم ○ اقبال اور مغرب کی مادیت و عقل پرستی 38

باب سوم ○ مغربی نظریۂ تعلیم اور اقبال 68

باب چہارم ○ وطنیت و قومیت کا مغربی تصور اور اقبال 106

باب پنجم ○ مغربی جمہوریت اور اقبال 128

پیش لفظ

وقت گزرنے کے ساتھ فکرِ اقبال کی تفہیم کے نئے زاویے سامنے آرہے ہیں۔ اقبال نے آج سے کم وبیش ایک سو دس برس پہلے مغربی تہذیب کا بہت قریب سے مشاہدہ کر کے، اس تہذیب کی خوبیوں اور خامیوں کا سیر حاصل تجزیہ کیا تھا۔

اس کتاب میں مغربی تہذیب کے پس منظر اور اس تہذیب سے منسلک چند تصورات کا فکرِ اقبال کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ان تصورات میں، مغرب کی مادیت وعقل پرستی، مغربی نظریۂ تعلیم، مغرب کا وطنیت اور قومیت کا تصور اور مغربی جمہوریت شامل ہیں۔

اقبال ایک روشن خیال اور حُریتِ فکر کے حامل دانش ور تھے لیکن اس کے باوجود مغرب کی روشن خیالی اور آزادیٔ فکر سے بے زار تھے۔ ان کے نزدیک مغرب کی یہ ظاہری چمک دمک اور اظہار کی آزادی کے بلند و بانگ دعوے محض عقلیت پرستی کا شاخسانہ ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ مغرب کی روشن خیالی، علم و دانش کی حضوری سے تہی دست اور عشق وعرفان کی حرارت سے محروم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی معاشرہ بظاہر آزادیٔ افکار اور علم و دانش کی روشنی کے باوجود تنگ نظری کا شکار ہے۔ دوسری اقوام کے حوالے سے، خاص طور پر اُمت مسلمہ کے باب میں، صداقت، حق پرستی اور انصاف سے قطعی محروم ہے۔

دورِ حاضر میں اُمت مسلمہ کی بے بسی ولاچاری اور مغرب کی چیرہ دستی، فکرِ اقبال کی تفہیم کے نئے رُخ سے متعارف کراتی ہے۔ مغربی تہذیب اور خاص طور پر اس تہذیب کے سرخیل امریکہ کی طاقت، علم اور جدید ٹیکنالوجی کی مرہونِ منّت ہے۔ آج اُس کی عسکری قوت کا دُور دُور تک مقابلہ نہیں۔ مغرب اور خصوصاً امریکہ کی سائنسی اور عسکری برتری کے سامنے اُمت مسلمہ بلکہ تمام دُنیا فکری اعتبار سے بے بس ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال مغربی تہذیب پر تنقید کے باوجود، اس تہذیب میں موجود علمی عناصر کو سراہتے ہیں اور اس میں موجود تحقیق و جستجو کے عمل کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مغرب آج ایک ناقابلِ تسخیر حقیقت ہے۔ اس کی تمام تر ترقی جدید علوم پر دسترس کا نتیجہ ہے لیکن اس کی ظاہری چمک دمک ہی کو سب کچھ سمجھ لینا، بڑی حماقت ہے۔ اقبال کے مطابق مسلمان اس کا مقابلہ صرف اسی صورت میں کر سکتے ہیں کہ وہ علم و دانش کے جادہ پر، روحِ عصر کے تقاضوں کو نبھاتے ہوئے، گامزن ہوں۔

اقبال نے وطنیت و قومیت کے مغربی تصور کو بھی اپنی فکرِ رسا کا حصّہ بنایا ہے۔ اُن کے نزدیک اسلام کے نقطۂ نظر سے قوم کی بنیاد دین پر ہے نہ کہ وطن پر۔ وطن پرستی کو وہ بُت پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وطنیت کا یہ تصور اقوام کی سوچ اور بصیرت کو محدود کر دیتا ہے۔ اقبال مغرب کے اس نظریہ کو اہل اسلام کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں سمجھتے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ اُمت مسلمہ کی نکبت و زبوں حالی میں ایک کردار اس تصور کا بھی ہے جس نے اُمت مسلمہ کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ مسلمان دُنیا کی کُل آبادی کا ایک چوتھائی حصّہ ہونے اور بے بہا وسائل رکھنے کے باوجود کمزور اور بے بس ہیں۔

اقبال اس حقیقت کا ادراک رکھتے تھے کہ جغرافیائی وطنیت پر مبنی قومیت کا یہ تصور نہ صرف ملّت کُش ہے بلکہ اسلام کی روح کے بھی منافی ہے۔ اُن کے نزدیک اسلامی نظریۂ قومیت کی بنیاد توحید و رسالت پر ہے جس کے نتیجے میں حُریت و مساوات اور اخوتِ بنی آدم، جیسے آفاقی اصول جنم لیتے ہیں۔ یہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ اقبال جغرافیائی تقسیم کے خلاف نہیں ہیں بلکہ جغرافیائی حدود کی پہچان کو دین و مذہب پر فوقیت دینا، اسلام کے منافی سمجھتے ہیں۔

اُن کے مطابق مسلمان اُمت مختلف ممالک سے منسوب تو ضرور ہے لیکن اس کی تشکیل اور اصل پہچان دین کی بنیاد پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اُمت کا روحانی اور آفاقی مرکز بیت اللہ ہے۔

افسوس آج اُمت مسلمہ میں فکرِ اقبال کی یہ تنویر کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

اسی طرح اقبال نے مغربی جمہوریت پر بھی تنقید کی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مغربی جمہوریت نے انسانی اخوت اور عالم گیر بھائی چارہ کے اعلیٰ نصب العین کو بُری طرح نظرانداز کیا ہے۔ اُن کے نزدیک مغربی جمہوریت سے سرمایہ دارانہ سوچ کے زیراثر بے قید آزادی اور لادین جمہوری اقدار نے جنم لیا ہے۔ اقبال مغربی جمہوریت کو نظامِ جنگ زرگری سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس کے برعکس اقبال اسلامی یا روحانی جمہوریت کی بات کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق اسلامی جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جبکہ مغرب میں اس کا سرچشمہ عوام کو قرار دیا گیا ہے۔ اقبال اسلامی جمہوریت کی روح ایسے آئین کو قرار دیتے ہیں جس کی بنیاد قرآن پر ہو۔

آج اُمتِ مسلمہ کے انتشار اور پریشان حالی کا ایک سبب، حاکمیت اعلیٰ کے اس تصور سے انحراف بھی ہے۔ کہیں بادشاہت وملوکیت ہے تو کہیں مغرب کا یہ بے روح جمہوری نظام مسلط ہے۔

زیرِنظر کتاب میں فکرِ اقبال کے انھی گوشوں کو پیش نظر رکھ کر دورِحاضر میں اُمت مسلمہ کے ادبار وزوال کی وجوہات جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوسکی ہے، اس کا صحیح فیصلہ پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر میں اپنے عزیز دوست پروفیسر آغا علی مزمل کا شکریہ ضرور ادا کروں گا کہ اُن کی تحریک وتاکید نے مہمیز کا کام کیا اور میں اس قابل ہوسکا کہ یہ کتاب ترتیب دے سکوں۔ اس کے علاوہ میں ممنوں رہوں گا اپنے رفیق کار ڈاکٹر قاسم محمود احمد کا، جو اس کتاب کی تزئین ومشاورت میں، اپنی عدیم الفرصتی کے باوصف ہر لمحہ پیش پیش رہے۔

رضوان احمد مجاہد

تقریظِ حمید

علم وفکر کی روایت میں بعض تصانیف ایسی ہوتی ہیں جو محض معلومات کی فراہمی پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ قاری کے ذہن میں سوالات کی نئی دنیا آباد کرتی، زاویۂ نگاہ کو وسعت دیتی اور فکری بالیدگی کے در وا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر رضوان احمد مجاہد کی تصنیف تہذیب جدید اور اقبال اسی نوعیت کی ایک سنجیدہ، بامقصد اور فکری طور پر توانا کاوش ہے۔ مصنف نے عرق ریزی، تحقیقی دیانت اور فکری توازن کے ساتھ اپنے موضوع کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ محض خواندگی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ سنجیدہ غور وفکر کے لیے مہمیز بن جاتا ہے۔

'تہذیب جدید اور اقبال' کا امتیازی وصف موضوع کو محض تاریخی یا نظریاتی دائرے تک محدود رکھنا نہیں ہے بلکہ اس کتاب میں موضوع کو عصرِ حاضر کے فکری، سماجی اور علمی تناظر سے مربوط کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مشکل اور پیچیدہ مباحث سادہ مگر علمی زبان میں بیان ہوئے ہیں، جس کے باعث یہ تصنیف اہلِ علم کے ساتھ ساتھ سنجیدہ عام قارئین کے لیے بھی یکساں طور پر مفید بن گئی ہے۔ رواں انداز بیان، حوالہ جاتی نظم وضبط اور فکری تسلسل کے باعث قاری کے لیے اس موضوع کی تفہیم بہت آسان ہوگئی ہے۔

کتاب کے ابواب یہ تفصیل مرحلہ وار واضح کرتے ہیں۔ ابتدائی باب میں مغربی تہذیب کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے یونانی تہذیب سے تعلق، فکری ماخذات اور بنیادی خصائص کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اقبال اور مغرب کی مادیت پرستی کے تناظر میں اُن عوامل پر روشنی ڈالی گئی ہے جنھوں نے مغرب کو مادیت اور عقلیت پرستی کی انتہا تک پہنچایا اور بالآخر مذہب سے انکار کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ تیسرے باب میں علامہ محمد اقبال کی فکر کی روشنی میں مغرب کے نظریۂ تعلیم کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا

ہے، جس میں تعلیم کے فکری و اخلاقی مضمرات نمایاں ہوتے ہیں۔ چوتھا باب وطنیت اور قومیت کے مغربی تصورات کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے اور علامہ اقبال کی فکر کی روشنی میں ان کے نقائص کو واضح کرتا ہے، ایسے نقائص جو آج کے سماجی، معاشرتی اور سیاسی ڈھانچوں پر گہرے اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ پانچویں باب میں مغربی جمہوریت کے بارے میں علامہ اقبال کے تصورات اور نظریات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے، جس سے قاری کو جدید سیاسی فکر پر ایک مختلف مگر بصیرت افروز زاویہ میسر آتا ہے۔

کتاب کے مندرجات اس حقیقت کے غماز ہیں کہ مصنف نے محض روایت پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ تنقیدی شعور کے ساتھ مختلف آرا کا جائزہ لیا ہے۔ جہاں اختلافِ رائے ضروری تھا، وہاں علمی وقار کو نظر انداز نہیں کیا گیا، اور جہاں اتفاق کی گنجائش تھی، وہاں اتفاق دلائل کے ساتھ کیا گیا۔ اس اسلوب سے نہ صرف مکالمے اور برداشت کی روایت مضبوط ہوتی ہے بلکہ قاری کو آزادانہ طور پر سوچنے اور نتائج اخذ کرنے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔

اس تصنیف کی ایک اور اہم خوبی یہ ہے کہ نظری اور عملی پہلوؤں کے درمیان توازن اور ربط قائم رکھا گیا ہے۔ فکری مباحث کے ساتھ عملی مثالوں، واقعات اور ٹھوس دلائل نے موضوع کو زندگی سے جوڑ دیا ہے، جس کے نتیجے میں اس کتاب کا مطالعہ محض فہم میں اضافہ نہیں کرتا بلکہ قاری کے فکری رویّے پر بھی مثبت اثر ڈالتا ہے۔

ڈاکٹر رضوان احمد مجاہد کی اس تصنیف میں نہ جذباتی سطحیت ہے اور نہ غیر ضروری پیچیدگی؛ بلکہ ہمیں ایک سنجیدہ اور متوازن نقطۂ نظر ملتا ہے۔ مختصراً، یہ کتاب اپنے موضوع کے حوالے سے ایک اہم علمی اضافہ ہے جس میں تحقیق، تنقید اور فکری بصیرت کا حسین امتزاج موجود ہے۔ امید ہے کہ یہ تصنیف طلبہ، محققین اور سنجیدہ قارئین کے لیے نہ صرف معلومات کا خزینہ ثابت ہوگی بلکہ انہیں نئے فکری افق دریافت کرنے میں بھی مدد دے گی۔

لاہور، 18 دسمبر 2025ء ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

تقدیم

کوئی تیرہ برس پہلے کی بات ہے کہ میں ہائر ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ آیا تو ڈاکٹر رضوان احمد مجاہد سے سلسلۂ رفاقت کا آغاز ہوا۔ تب سے آج تک ہمیشہ انھیں ایک پرخلوص اور محبِ وطن نظریاتی پاکستانی پایا۔ یوں تو ہم سب پاکستانی ہیں لیکن بدقسمتی سے بہت کم ایسے ہیں جو ارضِ پاک کے ساتھ پُرخلوص ہونے کے ساتھ ساتھ نظریاتی بھی ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ڈاکٹر صاحب کا افتخار بھی ہے اور امتیاز بھی۔

جب مجھے یہ پتا چلا کہ ڈاکٹر رضوان کی پی ایچ ڈی کا موضوع اقبال اور تہذیبِ جدید کے حوالے سے ہے تو میں نے جانا کہ مذکورہ اخلاص، حُب الوطنی اور نظریاتی ہونے کا اصل محرک کیا ہے۔ اس ادراک نے یہ عقدہ کشائی بھی کی کہ اگر تحقیقی موضوع اور فطری مزاج ہم آہنگ ہو جائیں تو مقالہ روایتی سندی تحقیق سے کہیں آگے نکل جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کام واضح طور پر اس حقیقت پر دال ہے۔ زیرِ نظر تصنیف ان کی انھی تحقیقی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔

دانائے راز، حکیم الامت، شاعرِ مشرق، مصورِ پاکستان، علامہ محمد اقبالؒ وہ عظیم ہستی ہیں جن کے فکر و فن پر گذشتہ ایک صدی میں دیگر فلاسفہ و ادبائے مشرق کے مقابلے میں بلا مبالغہ سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود اقبال شناسی کی یہ روایت آج بھی جاری و ساری ہے اور اہلِ قلم آج بھی فکرِ اقبال کے نئے گوشے دریافت کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر رضوان کی یہ تصنیف ا

قوت میں برملا ہوتا ہے۔ امریکی سائنسی اور عسکری قوت کے سامنے آج نہ صرف مسلمان بلکہ تمام دنیا فکری و عملی اعتبار سے گھٹنے ٹیکے ہوئے ہے۔ آج مغربی تہذیب بحیثیتِ کلی افکارِ عالم پر مسلط ہے۔ مغرب کی علمی ترقی بے شک مسلمان علما کی مہیا کردہ سائنسی بنیادوں پر استوار ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمان علوم کے اطلاقی پہلوؤں میں ہمیشہ کمزور رہے ہیں اور علم کو حقائقِ حیات پر منطبق نہیں کر سکے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مغرب آج ایک ناقابل تسخیر قوت ہے اور مسلمان اس کا مقابلہ اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب وہ علم و دانش کے جادہ پر روحِ عصر کے تقاضے نبھا سکیں۔ آج مسلمان علمی کوتاہی میں اس قدر آگے نکل چکے ہیں کہ جدید علوم وفنون پر دسترس ایک خواب دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف مغرب کی جدید تہذیب کے پردے میں فخر و مباہات کا اظہار ہے تو دوسری طرف احساسِ محرومی اور اس محرومی کے ردعمل میں غیر فطری انداز میں اعلان جنگ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے میدان میں فتح اور کامرانی انھیں قوموں کو نصیب ہوتی ہے جو زندہ رہنے کی لگن رکھتی ہوں۔ جدید علوم اور ٹیکنالوجی اور نئے وسائل پیدا کرنے پر قادر ہوں۔ بصورتِ دیگر موجودہ دور میں مسلمانوں کی حالتِ زار ہے، جو ہر طرح کے علوم وفنون سے تہی ہیں اور آگے بڑھنے کی لگن اور جستجو کو بھی خیر باد کہہ چکے ہیں۔ نتیجتاً غربت و افلاس اور ظلم و غلامی کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اقبال اپنی فکر میں اس حقیقت کا برملا اظہار کر چکے ہیں کہ یورپ کی ترقی جدید علوم پر دسترس کی بنا پر ہے اور اگر ہم ان کی ظاہری چمک دمک ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں تو یہ بہت بڑی غلطی ہے۔

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست
نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست

محکمیِ او را نہ از لا دینی است
نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ
مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ
اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست
ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست
فکرِ چالاکے اگر داری بس است
طبعِ دراکے اگر داری بس است
گر کسے شب ہا خورد دودِ چراغ
گیرد از علم و فن و حکمت سراغ[1]

اقبال اپنی بصیرت سے یہ سب جان چکے تھے کہ امت مسلمہ کی نظر یورپ کی مادی ترقی کے ظاہری روپ پر تو ہے لیکن وہ اس کے باطن کی خوبیوں سے بے بہرہ ہے۔ یورپ کی یہ باطنی خوبیاں دراصل اس کی علم و ٹیکنالوجی میں ترقی تھی جسے اقبال ستائش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک طرف تو جدید سائنس اور ٹیکنالوجی میں بے بہا ترقی تھی تو دوسری طرف پسماندگی، غربت و لاچاری اور ذہنی و تخلیقی قوتوں کی زبردست کمی کا ماحول تھا۔ اقبال کا

[1] اقبال، کلیات اقبال، فارسی، ص ۶۴۸

شکوہ بجا تھا کہ امت مسلمہ بے بہا وسائل رکھنے کے باوجود پسماندہ اور ناکارہ ہے، اس کی بنیادی وجہ اس کی دورِ جدید سے عدم مطابقت کا رویہ تھا، جو ہنوز جاری ہے۔ اس حوالے سے فتح محمد ملک لکھتے ہیں:۔

''اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی ذلت کا یہ سبب ہرگز نہیں کہ وہ ارکان اسلام کی ادائیگی میں کوتاہی کے مرتکب ہیں بلکہ اس گناہ کی پاداش میں رسوائی ان کا مقدر ہوگئی ہے کہ انھوں نے جو ہر ادراک گم کر کے اور نشتر تحقیق کند کر کے اسلام کی حقیقی روح کو فراموش کر دیا (ہے)''۔ [1]

اقبال علم کی جستجو کو، حدیثِ مبارکہ کہ علم مومن کی گمشدہ میراث ہے جہاں سے ملے اسے حاصل کرلو، کی روشنی میں، عبادت قرار دیتے ہیں۔ اس حوالے سے اپنے تیسرے خطبے 'ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور حقیقتِ دعا' میں لکھتے ہیں:

''دراصل علم کی جستجو جس رنگ میں بھی کی جائے، عبادت ہی کی ایک شکل ہے اور اس لیے فطرت کا علمی مشاہدہ بھی کچھ ویسا ہی عمل ہے جیسے حقیقت کی طلب میں صوفی کا سلوک و عرفان کی منزلیں طے کرنا''۔ [2]

علم کی راہ میں جہدِ مسلسل کرنے والے کا مقام و مرتبہ اقبال کے نزدیک بالکل ویسا ہی ہے جیسا مشاہدۂ حق کرنے والے سالک و عارف کا ہے۔ ان کے نزدیک علم اور اس کے متلاشی کی یہ قدر و قیمت اس لیے ہے کہ یہ حکمِ ربانی کی تعمیل میں عالمِ رنگ و بو کو تسخیر کرنے میں معاون و شریک ہے۔ یہ اپنے علم کی قوت سے آسمان کی وسعتوں کی خبر لاتا ہے اور کائنات پر حکمرانی کے لیے کمر بستہ ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال یورپ کی تمام تر مادی ترقی کے باوجود، اس کی تہذیب میں موجود

---

[1] فتح محمد ملک، اقبال فراموشی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء ص ۸۴

[2] اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، ص ۱۳۷

علمی عناصر کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ یورپ کی مادہ پرستی کو یک قلم مسترد نہیں کرتے بلکہ اس کے علم وحکمت اور تحقیق وجستجو کے عمل کو سراہتے ہیں اور اس کی تقلید کرنے کی بات کرتے ہیں۔ اقبال پیام مشرق میں لکھتے ہیں:

زندگی جہد است و استحقاق نیست
جز بعلم انفس و آفاق نیست
گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر
سیدِ کل صاحبِ ام الکتاب
پردگیہا بر ضمیرش بے حجاب
گرچہ عین ذات را بے پردہ دید
ربِ زدنی از زبان او چکید
علمِ اشیا داد مغرب را فروغ
حکمتِ او ماست می بندد ز دوغ[1]

یہی وجہ ہے کہ اقبال مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں کو سراہتے ہیں اور علمی تجسس کا مذاق رکھنے والوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تحسین فراقی اظہار خیال کرتے ہیں:

''یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی حد درجہ ضروری ہے کہ اقبال نے مغربی تمدن کو کلیتہً رَد نہیں کیا۔ ایک روشن ضمیر، حقائق آگاہ، انصاف پسند اور متوازن مزاج دانش ور ہونے کے ناتے انھوں نے مغربی تمدن کے مثبت

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، فارسی، ص ۲۰۱

پہلوؤں کو قابل تقلید بھی سمجھا۔ مغرب کے علمی تجسس اور اس کی حقائق کے لیے سرگرداں بے قرار روح کو اقبال نے داد کا مستحق بھی جانا ہے''۔ [1]

مغربی تہذیب کی عقلیت پرستی

اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب کی ایک خامی اس کی عقلیت پرستی ہے۔ ان کے نزدیک مغربی تہذیب کی بنیاد عقلیت پرستی پر استوار ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید تمدن انسانی افعال اور افکار کو عقل کے سوا کسی اور کسوٹی پر پرکھنے کو تیار نہیں ہے۔ اس کے برعکس اقبال عقل کو منزل تک پہنچنے کا کوئی حتمی اور قابل اعتبار ذریعہ نہیں سمجھتے کیونکہ اس کا تعلق محض حواس انسانی سے ہے جب کہ حواس پر کلی طور پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اکثر و بیشتر یہ ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ناموزوں ذرائع سے حاصل شدہ نتائج بھی ہمارے لیے حتمی نتیجے کے حامل نہیں ہو سکتے۔

مغربی تہذیب کے زیر اثر عقلیت پرستی کا یہ رجحان عالم اسلام میں بھی خطرناک رجحانات پیدا کرنے کا سبب بنا ہے۔ اس رجحان کے تحت معاشرے میں مغربی معاشرے کی طرز پر مادر پدر آزاد، آزادی کا تصور اجاگر ہوا۔ اس تصور کے باطن میں جہاں دینی و اخلاقی قدروں سے دست کشی اولین مقصد تھا وہاں آخرت اور خدا خوفی سے انحراف بھی اس تصور میں پوشیدہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال نے آزادی افکار کے اس رجحان کی حوصلہ شکنی کی اور اس کے خلاف بیزاری کا اظہار کیا۔ ان کے نزدیک مغربی تہذیب جن تانے بانوں سے عبارت ہے، ان میں ایک نمایاں دھاگہ عقلیت پرستی کا بھی ہے۔ جس کا نمایاں اور سب سے جدا رنگ اس تہذیب کے خدوخال میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فریدوں بدرہ ای نے لکھا ہے:

---

[1] فراق، تحسین ڈاکٹر، اقبال۔ چند نئے مباحث، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۱۰۸

''(اقبال کے ہاں مغربی تہذیب) معین جغرافیائی حدود سے وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک رمز و اشارہ اور علامت ہے، ایک ایسے معاشرے کی اطلاع ہے، ایسی سوسائٹی پر جو ہر چیز کو عقل کے ترازو میں تولنے کی خواہاں ہے۔ ہر گتھی کو انسانی تدبیر کے سر پنجے سے سلجھانے کی آرزومند ہے''۔ [1]

مغربی تہذیب کی بدقسمتی یہی ہے کہ اس نے عقل کو خود پر حاوی کر لیا اور زندگی کے ہر معاملہ میں اسے شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مغرب عقل کا تابع ہے اور اس کی کارواں سالار عقل ہے۔ عقل کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن یہ بہت ضروری ہے کہ زندگی کے ارتقا کو مناسب انداز میں آگے بڑھانے کے لیے عقل پر اخلاقی قواعد وضوابط اور مناسب پابندیوں کا اطلاق ہو۔ بصورت دیگر یہ ایک مہیب عفریت کی صورت میں انسانیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچائے گی، یہی خدشات اقبال کے سامنے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عقل بے شک ایک نادر اور بے بہا نعمت ہے لیکن اس کی ڈور اگر عشق کے ہاتھ میں ہو تو یہ بامراد ہو سکتی ہے۔ ان کے نزدیک عقل اور عشق کی معاونت ہی انسانی زندگی کو ابدی اندھیروں سے نکال سکتی ہے۔

مغربی تہذیب میں عقلیت پرستی کے بے جا رجحان اور اس کی قباحتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

''(اہل مغرب کے ہاں) مادی عالم اور عقلیت کے سوا اور کوئی چیز حقیقی نہیں ہے۔ اس تنگ نظر حکمت نے انسان کی مزید ترقی روک دی اور روحانیت سے معرا ہونے کی وجہ سے مادی ترقی بھی فساد انگیز ہو گئی''۔ [2]

---

[1] فریدوں بدرہ ای، ''کلام اقبال میں مشرق و مغرب'' ترجمہ: ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، مشمولہ: علامہ اقبال: حیات، فکر و فن، مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۸۷۴

[2] خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، ص ۲۳۸، ۲۳۹

عقلیت پرستی کے زیر اثر مغربی تہذیب جس آزاد خیالی سے فیض یاب ہو رہی تھی۔ اس کے اثرات مشرق پر بھی نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔ اقبال مغرب کی طرف سے آئی ہوئی روشن خیالی کا خیر مقدم تو کرتے ہیں لیکن اس معاملے میں بہت محتاط دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں خدشہ تھا کہ یہ روشن و آزاد خیالی کہیں عالم اسلام میں کسی تفرقہ اور انتشار کا سبب نہ بن جائے۔ اس حوالے سے اپنے چھٹے خطبے 'الاجتہاد فی الاسلام' میں رقم طراز ہیں:

> ''بہر حال ہم اس تحریک کا جو حریت اور آزادی کے نام پر عالم اسلام میں پھیل رہی ہے، دل سے خیر مقدم کرتے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیے، آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے۔ آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور انتشار کی طرف ہوتا ہے۔ لہٰذا نسلیت اور قومیت کے یہی تصورات جو اس وقت دنیائے اسلام میں کارفرما ہیں، اس وسیع مطمحِ نظر کی نفی بھی کر سکتے ہیں جس کی اسلام نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے۔ پھر اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ ہمارے مذہبی اور سیاسی رہنما حریت اور آزادی کے جوش میں، بشرطیکہ اس پر کوئی روک عائد نہ کی جائے، اصلاح کی جائز حدود سے تجاوز نہ کر جائیں''۔ [1]

اقبال نے مغربی تہذیب کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا تھا۔ وہ اس تہذیب کی بنیادی خصوصیات سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ صحیح معنوں میں اس تہذیب کے رمز شناس تھے۔ اس کے طور طریقوں اور رنگ ڈھنگ سے پوری آگاہی رکھتے تھے۔ وہ مغربی تمدن کی ظاہری چکا چوند دیکھ چکے تھے اور اس رنگ برنگ دنیا میں مضمر قباحتوں کا ادراک بھی کر چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مغربی تہذیب و تمدن جو ترقی کی معراج کو چھو رہے ہیں، ان کی بنیاد مادہ پرستی اور عقلیت

---

[1] اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، ص ۲۵۱، ۲۵۲

پرستی پر استوار ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ابتدا ہی میں اس تہذیب کی خودکشی کی طرف اشارہ کر چکے تھے۔ اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب کی بنیاد کیونکہ عقلیت پر استوار ہے اس لیے یہ کسی تخلیقی رو میں معاون نہیں ہوسکتی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان اسی نکتہ کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''اقبال یورپ کی عقلیت کو جو عقیدت سے یکسر عاری ہے، تاریخ کی تخلیقی رو کا مخالف سمجھتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ خالص مادیت کی بنیادوں پر کسی تہذیب کو استحکام نصیب نہیں ہوسکتا''۔ [1]

اقبال کی حیثیت ایک روشن خیال اور حریت فکر کے حامل داعی کی ہے لیکن اس سب کے باوجود وہ مغرب کی روشن خیالی اور آزادیٔ افکار سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور اس سب کو ابلیس کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔ وہ ایسی آزادی اور روشن خیالی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جو اپنے مرکز یعنی اسلام کی اصل سے جدا ہو چکی ہو۔ ان کے نزدیک آزادیٔ افکار سے فیض یاب ہونے کے لیے فکر و تدبر کا سلیقہ بہت ضروری ہے اور فکرِ خام آزادیٔ افکار سے بجائے فائدہ اٹھانے کے سخت نقصان اٹھا بیٹھے گی۔

آزادیِ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ [2]

آزادیٔ افکار جب عقلیت پرستی کے زیر اثر آئی تو بجائے روشن خیالی کے مغربی معاشرے میں تنگ نظری کا سبب بنی۔ مغربی علوم کے تحت نام نہاد دانشوری کی ایسی وبا پھوٹی کہ اس نے بنیادی اعتقادات اور اعمال کو ہلا کر رکھ دیا۔ نتیجتاً اخلاص، صداقت، ایثار و مروت

---

[1] یوسف حسین خان، ڈاکٹر، روح اقبال، ص ۲۵۰

[2] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۵۸۹

اور حق پرستی سب کچھ ناپید ہو گیا۔ اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب کی آغوش میں پروان چڑھنے والی عقل و دانش کی نسل عشق و اخلاص کی شفقت سے محروم ہے یہی وجہ ہے کہ یہ سوز سے تہی اور تڑپ سے بے نیاز ہے۔ حق وصداقت کی سرمستی اسے چھو کر بھی نہیں گزری اور یہ خدا کی شناخت سے بھی عاجز و معذور ہے۔ اس نے حرم سے ناتا توڑ کر طرح طرح کے بت تراش لیے ہیں اور انھیں کی پوجا اور انھی کی تجارت اس کا طرز زیست ہے۔

سوزِ عشق از دانش حاضر مجوے
کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجوے
مدّتے محوِ تگ و دو بودہ ام
راز دانِ دانشِ نو بودہ ام
باغباناں امتحانم کردہ اند
محرمِ ایں گلستانم کردہ اند
گلستانے لالہ زار عبرتے
چوں گل کاغذ سراب نکہتے
تا ز بند ایں گلستاں رستہ ام
آشیاں برشاخ طوبیٰ بستہ ام
دانشِ حاضر حجابِ اکبر است
بت پرست و بت فروش و بت گر است [1]

علم و دانش کی بے حضوری ہی کی وجہ سے اقبال مغربی تہذیب کو بدنصیب اور منزل سے بھٹکی ہوئی تہذیب قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تہذیب عقلیت پرستی کے زیر اثر افکار و خیالات کی آزادی میں اس قدر دور نکل چکی ہے کہ جہاں سے منزل کا جادہ دھندلا گیا ہے۔

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، فارسی، ص ۸۲

اقبال کے خیال میں اس تہذیب کی عقلیت پرستی ہی ہے جس نے اسے اخلاص وعقیدت اور سوز وگداز سے محروم کر دیا ہے۔

ہنٹنگٹن نے مغربی تہذیب کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس تہذیب کی ترکیب میں کلاسیکی ورثہ، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ممالک شامل ہیں۔ اس کے علاوہ یورپی زبانیں، دین ودنیا اور کلیسا وسیاست کی جدائی کا عنصر بھی اس تہذیب کی بنیادی خاصیت ہے۔ اس کے مطابق اس تہذیب کی اٹھان میں اہل روما سے ملی ہوئی قانون کی حکمرانی اور فرد کی انفرادیت نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہنٹنگٹن کے نزدیک مغرب کی جدیدیت اور اس کے تمام تصورات کی بنیاد اس وسیلے سے مادیت اور عقلیت پر مبنی ہے۔ [1] اسی عقلیت پرستی پر جدید مغرب کی اور اس کی چکا چوند کی بنیاد ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی فکر اقبال میں عقلیت پرستی سے بیزاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''(اقبال کے مطابق) مغربی تمدن کے باطن میں مغربی فکر کے آغاز کے ساتھ ہی عقل کی آزاد حیثیت کارفرما ہوگئی تھی۔ چنانچہ وہ تہذیبِ مغرب کے جلووں کو 'بے کلیم' اور اس کے شعلوں کو 'بے خلیل' قرار دے کر گویا اسے گرمیِ عشق وعرفان سے کلیتہً محروم قرار دیتے ہیں''۔ [2]

یہ اس تہذیب کی عشق وعرفان سے محرومی ہی کا نتیجہ ہے کہ علوم جدیدہ کی رو میں بہتے ہوئے عقل کو قافلہ سالار بنا کر اس نے روحانیت کو یک لخت خیر باد کہہ دیا اور محض جسمانی ضروریات ہی کو اوّلیت کا شرف بخشا۔ اس اندازِ فکر سے مغرب میں نیکی اور بدی میں امتیاز ناپید ہوگیا اور وہاں ہمدردی وغم گساری کے اوصاف ختم ہو گئے۔ مغرب کی عقلیت پرستی کے

---

[1] ہنٹنگٹن، سمیوئیل پی، *Clash of Civilizations*، ترجمہ بعنوان: تہذیبوں کا تصادم از سہیل انجم، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۸۳، ۸۴، ۸۵

[2] فراقی، تحسین ڈاکٹر، اقبال چند نئے مباحث، ص ۹۹

ہاں نیکی اور بدی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ محبت و نرمی کے بجائے سنگ دلی کو انسان کے ماتھے کا جھومر سمجھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ علم و فن میں پاکیزگی کا عنصر ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ عقل کی ہمہ گیری نے ظاہر داری اور مادہ پرستی کو عام کیا ہے۔ اخلاق و روحانی قدریں مغرب کی مادہ پرستی اور عقلیت کے زیر اثر دم توڑ چکی ہیں۔ اخلاق و روحانی انحطاط کے سبب ہی معاشرے میں خوف اور بے یقینی کی فضا مسلط ہے۔

مغربی تہذیب کی عقل پرستی کی بنا پر، زندگی کے حقائق اور روح سے بیگانگی کی تائید اقبال کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے:

ہوا نہ زور سے اس کے کوئی گریباں چاک
اگرچہ مغربیوں کا جنوں بھی تھا چالاک
یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک[1]

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل
مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت، کہاں حجابِ دلیل[2]

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۳۹۳، ۳۹۴

[2] ایضاً، ص ۳۹۱

عقل عیار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم [1]

ضرب کلیم میں عقل کی عیاری کا ذکر یوں کرتے ہیں:

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا، جذبِ عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شب تارِ حیات [2]

عقلیت پرستی کے رجحان نے مغربی تہذیب کو مادی نقطۂ نگاہ عطا کیا۔ جس کی بنیاد پر ظاہری ترقی کے نمونے تو وجود میں آئے لیکن باطنی دلکشی اور پاکیزگی جاتی رہی۔ اقبال **ارمغان حجاز** میں لکھتے ہیں:

ہیں گرچہ بلندی میں عماراتِ فلک بوس
ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانۂ آباد
تیشے کی کوئی گردشِ تقدیر تو دیکھے
سیراب ہے پرویز، جگر تشنہ ہے فرہاد [3]

جہاں تک حقیقت تک رسائی اور سرچشمہ ہائے علم وفن کا تعلق ہے تو اہلِ مغرب کے ہاں پروان چڑھنے والے جدید علوم کی بنیاد یونانی تہذیب ہے۔ یونانیوں کے نزدیک سچے علم کی بنیاد محض عقل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج جدید مغربی تہذیب بھی اپنے تمام تر جدید علوم کی بنیاد نہ صرف عقل پر رکھے ہوئے ہے بلکہ کسی دوسرے ذریعۂ علم کو ماننے سے گریزاں بھی ہے۔

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۳۸۹
[2] ایضاً، ص ۵۵۱
[3] ایضاً، ص ۷۲۲

اقبال علمی معاملات میں عقل کی اہمیت و افادیت کے قائل ہیں لیکن وہ اس کی حدود و قیود کا تعین بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے نزدیک علم کا ایک معتبر ذریعہ وحی و الہام بھی ہے۔ اس کے برعکس جدید مغربی تہذیب عقل کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہوئے وحی کو نہ صرف بے اعتبار گردانتی ہے بلکہ سرے کے اس کا انکار بھی کرتی ہے۔

اقبال وحی کے علاوہ دو اور ذرائع علم کی جانب توجہ دلاتے ہیں یعنی انفس و آفاق۔ اس سلسلے میں وہ اپنے پانچویں خطبے، اسلامی ثقافت کی روح میں وضاحت کرتے ہیں:

> ''قرآن مجید نے آفاق و انفس، دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے اور اس کا ارشاد ہے کہ آیات الٰہیہ کا ظہور محسوسات و مدرکات میں، خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل کی، ہر کہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے اس کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا کما حقہ اندازہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے حصول علم میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے''۔ [1]

جہاں تک علم انفس و آفاق کا تعلق ہے تو پروفیسر عزیز احمد نے اس سے ذاتی اور خارجی دنیا کا علم مراد لیا ہے۔ ان کے نزدیک علم الاسما سے مراد علمِ اشیا ہے اور اسی کی تسخیر سے آج مغرب اس مقام پر فائز ہے۔ [2] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کے نزدیک علم انفس و آفاق سے مراد فلسفہ و نفسیات اور سائنس و ٹیکنالوجی کا علم ہے۔ [3]

اقبال کے ہاں انفس و آفاق کی ہم آہنگی حقیقی ترقی کی بنیاد ہے۔ ان کی تعلیمات میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی قوت عمل کو ابھارنے کی تلقین سرفہرست ہے۔ ان کے نزدیک

---

[1] اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، ص ۱۹۴

[2] عزیز احمد، اقبال۔ نئی تشکیل، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۸ء ص ۷۳

[3] عابد حسین عابد، لیفٹیننٹ کرنل (ر)/عبدالستار غوری، علامہ اقبال اور ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کا فلسفہ دید و نظر، ولی محمد ٹرسٹ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۹۰ بحوالہ ڈاکٹر محمد آصف، اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۹ء، ص ۱۹۸

زندگی کا سر پرغرور ہمیشہ عمل کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا ہے۔ اس لیے اقبال فکر و عمل کی بالیدگی اور طہارت کے لیے اسے عقلیت پرستی کے شکنجے سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے افکار میں مغربی تہذیب پر تنقید کا بنیادی پہلو مغرب کا عقل کو فوقیت دینا بھی ہے۔ اقبال عقل کو مکمل رد کیے بغیر عشق کی بنیاد پر ایسی تعلیم کے قائل ہیں جو ظاہری ترقی کے ساتھ باطنی نکھار کا بھی اہتمام کرے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان فکر اقبال کے اس رخ کی وضاحت علم انفس و آفاق کے تناظر میں یوں کرتے ہیں:

> ''انسان کو انفس و آفاق دونوں ہی کو اپنے منشا کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ وہ عالم فطرت اور عالم نفس دونوں کے قوانین کا رمز شناس ہو، جس طرح خارجی عالم پر سائنس اور ٹیکنیک سے تصرف حاصل ہوتا ہے اسی طرح انسان اپنی اندرونی اور ذاتی زندگی میں اخلاق کے ذریعے تہذیب نفس کرتا ہے۔ عمل کے دونوں پہلو جب تک پیش نظر نہ رہیں اس وقت تک انسانی زندگی ترقی اور تکمیل کی راہ پر پوری طرح گامزن نہیں ہوسکتی۔ تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ باوجود ٹیکنیک کی ترقی کے، تہذیبوں کو زوال آیا۔ اسپارٹا کی فوجی ٹیکنیک نہایت اعلیٰ قسم کی تھی لیکن اہل سپارٹا کی زندگی کے نفسیاتی اور تہذیبی سانچے ادنیٰ درجے کے تھے۔ اس لیے ان کی ترقی اور نشوونما رک گئی''۔ [1]

یہ مغربی تہذیب کی عقلیت پرستی ہی کے نتائج ہیں کہ آج دنیا بھر میں کشت و خون کا بازار گرم ہے۔ دنیا بھر کو تاخت و تاراج کیا جا رہا ہے۔ پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کو معاشی و سیاسی استحصال کے شکنجے میں جکڑا جا رہا ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، ریاستوں کے مفادات کو عزیز رکھا جاتا ہے۔ ماضی میں نوآبادیوں کا قصہ ہو یا موجودہ دور میں

---

[1] یوسف حسین خان، ڈاکٹر، روح اقبال، ص ۱۷۱

اپنی حاکمیت کی انا کی تسکین کے لیے قتل و غارت گری کی لرزہ خیز داستان ہو۔ ان سبھی کی بنیاد میں مغربی تہذیب کی عقلیت پرستی پر استوار مادی سوچ کارفرما ہے۔

اقبال نے اپنی فارسی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں مغربی تہذیب کے اسی استحصالی اور استعماری ہتھکنڈوں کی تصویر کشی کی ہے۔ ان کے نزدیک اہلِ مغرب نے دنیا بھر کی اقوام پر ظلم و ستم کی نئی داستان رقم کر دی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ وہ کفن چوروں کا ایک ٹولہ ہے۔ جس سے خیر کی امید رکھنا عبث ہے۔

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر
فتنہ ہا در آستینِ او نگر
از فریبِ او اگر خواہی اماں
اشترانش را زِ حوضِ خود براں
حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد
وحدت اعرابیاں صد پارہ کرد
تا عرب در حلقہ دامش فتاد
آسماں یک دم اماں او را نداد[1]

مغرب کی عقل عیار اور فکر لادین نے انسانیت کے لیے مصائب کے پہاڑ کھڑے کیے ہیں۔ اسی بنا پر اقبال اس تہذیب کی مکروہ اور سازشی ذہنیت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کے نزدیک مغرب کی فکری اور استعماری تاخت و تاراج نے انسان کے لیے جہنم کا سامان پیدا کر دیا ہے۔ اس لیے سلامتی اسی میں ہے کہ اس تہذیب کی ظاہر پرستی اور بناوٹی چکا چوند سے متاثر ہونے کی بجائے مسلمان اپنی اصل کی طرف رجوع کریں۔

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، فارسی، ص ۱۱۷

اقبال عقل کو مکمل طور پر رد نہیں کرتے لیکن وہ اس کی حدود و قیود ضرور متعین کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عقل کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ لیکن محض عقل کا اسیر ہو کر رہ جانا انسانیت کی روح کو فراموش کر دینے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مغرب کی عقلیت پرستی کے تناظر میں فکر اقبال کا تجزیہ کرتے ہوئے بجا فرماتے ہیں:

> ''اقبال کا حقیقی عقیدہ یہ تھا کہ عقل ایک خداداد نعمت ہے اور انسانوں اور حیوانوں میں تمیز و فرق قائم کرتی ہے لیکن اس کی حقیقت کے کچھ حدود ہیں۔ ان حدود کے باہر اس کے دعوے لا حاصل اور لایعنی ہو جاتے ہیں لیکن ان حدود تک عقل سے زندگی کا احاطہ کرنا اور فطرت خارجی کی تسخیر سے قوت حاصل کرنا انسان کے لیے لازمی ہے''۔ [1]

مغرب کی عقلیت پرستی کے زیر سایہ انسانی روح کے تمام تر تقاضے مادی ترقی اور ایجادات کے ہجوم میں ان پھولوں کی طرح ایسے پژمردہ ہو جاتے ہیں، جنھیں پانی اور روشنی جیسی بنیادی ضروریات سے محروم کر دیا گیا ہو۔ اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب کی بنیادی خامی بھی یہی ہے کہ اس نے انسانیت کو یک رخی ترقی سے تو روشناس کرایا ہے لیکن حقیقی ارتقا سے وہ خود بھی نا آشنا ہے۔ اس کا حل اقبال کے نزدیک عقل و عشق کا تال میل ہے، جس سے نہ صرف نئے انکشافات اور اکتشافات ہوتے ہیں بلکہ انسانیت روحانی بالیدگی کی منزلوں سے بھی آشنا ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک عقل، عشق کے بغیر محض خود غرضی اور مفاد پرستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کا عقلیت پرستی پر مبنی جدید نظام زندگی سنگ دلانہ اور خود غرضانہ انداز زیست کا نمونہ ہے۔

❑❑❑

---

[1] خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، ص ۲۳۹

باب سوم

مغربی نظریۂ تعلیم اور اقبال

افراد اور اقوام کی زندگی میں تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم ہی وہ بنیاد ہے جس پر کسی فرد کی انفرادی اور بعد ازاں معاشرے کی اجتماعی زندگی استوار ہوتی ہے۔ تاریخ میں اقوام اپنے تعلیمی فلسفہ اور طریقہ کار کی وجہ سے مقام حاصل کرتی ہیں۔ ان کے نصب العین، مقاصد حیات، تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاشرت پر تعلیم اثر انداز ہوتی ہے۔

جدید مغربی تہذیب سے وابستہ نظام تعلیم کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ اس کی مادی ترقی، جو آج بام عروج کو چھو رہی ہے، اس کے نظام تعلیم کا کیا عمدہ تعارف ہے۔ اس تعلیم نے اہل مغرب کو سائنس دان، عالم، ماہر ریاضی، فلسفی، صنعت کار اور سیاست دان عطا کیے ہیں۔ مغربی تعلیم کے ان فیض یافتہ افراد نے دنیا کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا لیکن کیا یہ ترقی حتمی اور دیرپا ترقی ہے۔ کیا اس ترقی کو انسانیت کی معراج خیال کیا جا سکتا ہے اور کیا یہ ترقی روح کی بالیدگی اور طہارت جیسے اعلیٰ فرائض سرانجام دینے میں معاون ہے۔

یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب مغربی نظام تعلیم کے بارے میں مثبت یا منفی رائے قائم کرنے میں معاون ہوں گے۔ اس سے پہلے درج ہوا ہے کہ کسی قوم کا نظام تعلیم نہ صرف اس کے نصب العین کا تعین کرتا ہے بلکہ اس کے مقصد حیات کو بھی آگے بڑھاتا ہے۔ یہ نظام تعلیم ہی ہے جو تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاشرت کی ترویج و ارتقا میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ مغرب کے نظام تعلیم کا اس انداز سے جائزہ لیا جائے تو اس تلخ حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ یہ تعلیمی نظام معاشرے میں مادی ترقی اور ظاہری چکاچوند کو پروان چڑھانے میں تو پیش پیش ہے لیکن انسان کی حقیقی ضرورت، اس کی روحانی و اخلاقی نشوونما میں بُری طرح ناکام ہے۔

اقبال نے مغربی تعلیم پر گہری نظر ڈالی ہے اور اپنے افکار کے ذریعے نہ صرف مغربی تعلیم کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے بلکہ اپنی قوم کے لیے بھی ایسی راہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک زندہ اور باوقار قوم کی تخلیق میں معاون ہو۔ ان کے دور میں برصغیر میں دو طرح کے نظام تعلیم رائج تھے۔ ایک قدیم دینی نظام تعلیم تھا جو مذہبی مدارس میں رائج تھا۔ یہ طریقہ تعلیم صدیوں سے جوں کا توں چلا آ رہا تھا اور وقت کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ دوسرا نظام انگریز حکومت کا عطا کردہ تھا جو لارڈ میکالے کی فکر کا پیدا کردہ تھا۔ اس نظام تعلیم کا مقصد نوجوانوں کی اس نہج پر تعلیم و تربیت کرنا تھا کہ وہ اپنی ذہنی و فکری صلاحیتوں سے بے نیاز ہو کر محض مشینری کے کل پرزے بن جائیں اور ان کی تمام تر ذہنی وابستگی حکمرانوں کے مفادات سے وابستہ ہو۔ ان دونوں نظاموں میں کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ قوم کی امنگوں اور مقاصد کا ترجمان ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی فکر میں، ان پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔

اقبال جہاں مغربی طریقہ تعلیم اور فکر و خیالات کو پوری طرح قبول نہیں کرتے وہاں وہ اپنے قدیم طرز تعلیم اور اس کے معیار سے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک ایک ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو قدیم و جدید کا امتزاج ہو۔ وہ اپنے نوجوانوں کو تعلیم دینے والے اساتذہ کا تعلیمی معیار اور نصاب بھی متعین کرنا چاہتے ہیں اور ایک ایسے تعلیمی ادارے کے قیام کے خواہاں ہیں جس کی مسند نشیں اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی دلکش آمیزش ہو۔ اس سلسلے میں ان کے مقالے، ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مسلمانوں کو بے شک علوم جدیدہ کی تیز رفتاری کے قدم بہ قدم چلنا چاہیے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس تہذیب کا رنگ، خالص اسلامی ہو —— کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علما اور واعظ سرانجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے لیے پوری

طرح سے اہل نہیں ہیں۔ اخلاق و مذہب کے اصول کی تلقین کے لیے موجودہ زمانہ کے واعظ کو تاریخ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہیے۔۔۔ نیا مثالی دارالعلم قائم کیا جائے جس کی مسند نشیں اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش دلکش انداز سے ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویر مثالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے اس کے لیے اعلیٰ تخیل، زمانے کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے''۔ [1]

اقبال اس حقیقت سے باخبر تھے کہ قدیم دینی مدرسوں میں دی جانے والی تعلیم طلبہ کو ارکان اسلام سے واقف اور فقہی مسائل سے آگاہ تو کر رہی ہے لیکن یہ تعلیم دین کی صحیح روح سے مکمل طور پر عاری ہے۔ ان مدرسوں میں پڑھائے جانے والے نصاب تعلیم کا، مشاہدہ کائنات اور تسخیر کائنات سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ زندگی کے گوناگوں مسائل کو سمجھنے اور ان کے حل کے ادراک سے بری طرح محروم تھے۔ یہ طلبہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا جواب دینے سے قاصر تھے۔ سائنس، فلسفہ، ادب اور معاشرت کے دیگر علوم سے ناواقف تھے۔ یہ ایک محدود دنیا کے افراد تھے جن کی دنیا محض ان کی چار دیواری تک محدود تھی اور یہ اس میں صرف نماز روزے اور دیگر عبادات میں مشغول تھے۔ اس کے برعکس سیاسی اور بین الاقوامی معاملات اور مسائل کی انہیں سرے سے خبر ہی نہیں تھی۔

اقبال کے نزدیک ان مدرسوں سے فارغ ہونے والے طلبہ معاشرے کے لیے کوئی

---

[1] اقبال، مقالات اقبال (ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر) مرتبہ عبدالواحد معینی، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۷۵، ۱۷۶

سودمند کردار ادا کرنے سے محروم تھے۔ یہ آپس کی بحث وتکرار اور لڑائی جھگڑوں کے علاوہ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے تو صادر کر سکتے تھے لیکن دین کی صحیح خدمت اور اس کی روح کو زندہ رکھنے سے قاصر تھے۔ اقبال نے ایسے بے روح افراد کو 'ملا' کے نام سے پکارا ہے۔ ان کے نزدیک یہ لوگ تنگ نظر، متعصب، جاہل اور رجعت پسند واقع ہوئے تھے۔ آج بھی مذہبی تعلیم کا خواہاں ایک طبقہ بالکل اسی دور کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ جو بسم اللہ کے گنبد میں بند اپنے گردوپیش کے مسائل اور تبدیلیوں سے بے خبر ہے۔ اسے تسخیر کائنات اور مشاہدہ کائنات کی اسلامی تعلیمات سے قطعی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ طبقہ اسلام کی نشاتِ ثانیہ کے خواب تو دیکھتا ہے لیکن حقیقت میں اس خواب کی تعبیر کے حصول کے عملی تقاضوں سے غافل ہے۔ اقبال نہایت دردمندی سے اس طبقے کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ دوبارہ عروج کا خواب ایک محدود ذہن سے نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی روح پر عمل پیرا ہو کر شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ ان کا یہ پیغام آج بھی اسی طرح کارگر اور برمحل ہے:

> ''اگر اسلام کی نشات ثانیہ ناگزیر ہے، جیسا کہ میرے نزدیک قطعی طور پر ہے، تو ہمیں بھی ترکوں کی طرح ایک نہ ایک دن اپنے عقلی اور ذہنی ورثے کی قدر و قیمت کا جائزہ لینا پڑے گا۔ لہٰذا اگر ہم اسلامی فکر میں کوئی خاص اضافہ نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا ہی کرنا چاہیے کہ آزاد خیالی کی اس تحریک کو جو دنیائے اسلام میں بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے کچھ یونہی روکنے کی کوشش کریں کہ قدیم نقطۂ نظر کے ماتحت اس کی تنقید صحت مندی سے ہوتی رہے''۔ [1]

اپنے عقلی اور ذہنی ورثے کی قدر و قیمت کا جائزہ لینے اور اس پر صحت مند تنقید کرنے

---

[1] اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، ص ۲۳۶

کے لیے اجتہاد کے دروازے سے داخل ہونا پڑتا ہے۔ جب کہ امتِ مسلمہ اس دروازے کو اپنے اوپر خود سے بند کر چکی ہے۔ اقبال اجتہاد کی اہمیت کے پیش نظر کہہ چکے ہیں کہ اگر ہمارے افکار میں وسعت اور دقت نظر موجود ہے اور ہم نئے نئے احوال اور تجربات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ فقہ اسلامی کی تشکیل نو میں جرات سے کام لیں۔[1] اقبال کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے محض ایک افسانہ ہے۔[2] ان کے نزدیک ملت اسلامیہ کی زبوں حالی اور علمی پستی کے محرکات میں سے نمایاں محرک اجتہاد کی طرف سے غفلت کا مظاہرہ ہے اور اس غفلت میں کلیدی کردار ملائیت و پیری کا ہے۔ اقبال نے اپنے افکار میں برملا ملوکیت، ملائیت اور خانقاہیت کے زہریلے اثرات پر تنقید کی ہے۔ وہ زندگی کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے، اسے جدید افکار کی روشنی میں مزین کرنے کے حامی ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام ایک انقلابی قوت ہے جو معاشرے کے ہر پہلو کا مکمل احاطہ کرتی ہے جب کہ اس کے برعکس ملائیت، تنگ نظری، قدامت پرستی، ماضی پرستی، خود غرضی، شدت پسندی، جہالت اور فکری و ذہنی غلامی کی علمبردار ہے۔

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا، حمیت میں فرد

---

[1] اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، ص ۲۷۵

[2] ایضاً، ص ۲۷۴

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا[1]

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ[2]

کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و میخانہ ہیں مدت سے خموش[3]

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام[4]

اقبال قدیم طرزِ تعلیم اور فرسودہ سوچ کے حامل 'ملا' سے نالاں ہیں کیونکہ یہ دونوں دین کی اصل روح سے بیگانہ ہیں۔ اس کا نماز روزہ سب کچھ رسمی انداز اختیار کر گیا ہے جب کہ حیات کے ارفع و اعلیٰ مقاصد تک اس کی ذہنی پرواز کجی کا شکار ہو گئی ہے۔ اقبال اس سلسلے میں مغربی تعلیم اور جدید علوم و فنون کے قبول کرنے میں بھی عار نہیں سمجھتے لیکن وہ اس حوالے سے بہت احتیاط کا تقاضا کرتے ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کی صحت مند اقدار، سائنس اور ٹیکنالوجی کے قبول کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک مغرب سے یہ سب لینا اس لیے

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۴۵۱، ۴۵۳
[2] ایضاً، ص ۳۷۸
[3] ایضاً، ص ۳۹۹
[4] ایضاً، ص ۵۳۷

غیر اسلامی نہیں کیونکہ ہم مغرب سے وہی کچھ واپس لے رہے ہیں جو تاریخ کے ایک مرحلے پر مغرب نے ہم سے لیا تھا لیکن اس میں احتیاط طلب امر یہ ہے کہ مسلمان مغرب کی ظاہری چمک دمک کی بجائے حقیقی روح کو حاصل کریں۔[1] اس نقطۂ نگاہ سے مغربی تہذیب اور جدید علوم، اسلام کے لیے خطرہ نہیں بلکہ اس کی تعمیر و ترقی میں ممد و معاون ہوں گے۔ اقبال کے نزدیک یہ خوفزدہ ہونے کی بات نہیں بلکہ مسلمانوں کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔[2]

ڈاکٹر محمد علی صدیقی فکر اقبال کے اس گوشے کا تجزیہ کرتے ہوئے بجا فرماتے ہیں:

> ''(اقبال) مغربی تہذیب کو کلیتہً ناپاک سمجھ کر اسے یکسر مسترد کرنے کے رویے کو ضرر رساں خیال کرتے ہیں یعنی ملت مسلمہ پر لازم آتا ہے کہ مغربی تہذیب نے علم و دانش کی ترقی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کو خاطر میں لایا جائے اور اپنے نظام معتقدات اور اقرار کے ساتھ مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں سے مطابقت تلاش کرے۔ یہ دعویٰ کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اس امتزاج کو اور بھی ضروری بنا دیتا ہے''۔[3]

اقبال مغربی تہذیب کے عمدہ پہلوؤں کی خوشہ چینی کی تلقین تو کرتے ہیں اس سلسلے میں جدید مغربی تعلیم اور سائنس و ٹیکنالوجی سے استفادہ کا درس بھی دیتے ہیں لیکن وہ مغربی تعلیم کو کلی طور پر اپنانے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ اس تعلیم کی مادہ پرستی اور عقلیت پرستی پر بنیاد سے سخت نالاں ہیں۔ ان کے نزدیک انہی وجوہات کی بنا پر جدید تعلیم انسانیت کشی اور انسانی اقدار کی پامالی کی طرف گامزن ہے۔ بانگِ درا کی نظم 'مذہب' میں اقبال نے مغربی نظامِ تعلیم

---

[1] اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، ص ۱۱

[2] نذیر نیازی، سید، اقبال کے حضور، اقبال اکادمی، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۲۸۵

[3] محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، تلاش اقبال، پاکستان سٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۳۰، ۱۳۱

کی نفسیات یوں بیان کی ہے:

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثال برہمن صنم تراش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام، وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش [1]

اقبال کے نزدیک جدید علم بے یقینی اور شک و شبہ کو ہوا دیتا ہے۔ یہ نہ صرف احساس کمتری میں مبتلا کرتا ہے بلکہ ذہنوں میں انتشار کا باعث بھی بنتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ جدید علم روح کو طہارت اور بالیدگی بخشنے کی بجائے آلودہ اور کثیف کر دیتا ہے۔ 'بندگی نامہ' میں اسی طرح کے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

علمِ حاضر پیش آفل در سجود
شک بیفزود و یقیں از دل ربود
بے یقیں را لذتِ تحقیق نیست
بے یقیں را قوتِ تخلیق نیست
بے یقیں را رعشہ ہا اندر دل است
نقشِ نو آوردنِ او را مشکل است

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۲۷۵، ۲۷۶

از خودی دور است و رنجور است و بس
رہبرِ او ذوقِ جمہور است و بس[1]

اقبال مغربی تہذیب وتمدن سے بخوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے مغربی مدرسہ ہائے فکر سے استفادہ کیا تھا اور بذات خود اس ماحول کو دیکھا تھا۔ اس لیے اقبال مغربی تعلیم کے اس پہلو کو جس میں نری مادہ پرستی اور عقلیت پرستی کی پیروی میں مذہب کو رد کر دینے کا درس تھا، اسے مسلمان نوجوانوں کے لیے سم قاتل تصور کرتے تھے۔ انہیں شکوہ ہے کہ مسلمان مغرب کی ہر چیز کو بلا سوچے سمجھے قبول کیے جا رہا ہے۔ اقبال بار بار کہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان کو مغربی تعلیم نے خود سے بیگانہ کر دیا ہے اور اس کی نظروں کو ایسا خیرہ کیا ہے کہ وہ نہ صرف مغرب کی ظاہری حالت پر مر مٹا ہے بلکہ اپنی تاریخ اور روایات سے بھی بیگانگی اختیار کر لی ہے۔

اقبال مغرب کی اندھی تقلید کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک مغرب کی جدید تعلیم انسان کو مادہ پرستی اور دہریت سے قریب اور مروت و اخلاص سے دور کر رہی ہے۔

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف[2]

اسی حوالے سے اقبال اپنے مقالے 'ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر' میں مسلمان نوجوان کو خبردار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولاں گاہ بنا ہوا ہے۔ اپنی قومی روایات کے پیرائے سے عاری ہو کر اور مغربی لٹریچر کے نشے میں ہر وقت سرشار رہ کر اس نے اپنی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے ـــــ ہمارا نوجوان اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہے۔

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، فارسی، ص ۴۶۴
[2] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۵۹۹

اسے مغربی تہذیب کے مشاہیر سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عقل و ادراک کی لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے''۔ [1]

اقبال جہاں قدامت پرستوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں وہاں وہ مغربی تہذیب اور جدید تعلیم کے ضمن میں اندھی تقلید کرنے والوں کو بھی نہیں بخشتے۔ انہیں اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں مسلمان نوجوان مغرب کی تہذیبی روح کو سمجھے بنا اس کی نقالی اور تقلید کا شکار نہ ہو جائے۔ انھوں نے قوم کے نوجوانوں کو یہ پیغام دیا کہ وہ اہل مغرب کی سطحی نقالی کی بجائے ان کے حقیقی محاسن یعنی ذوق عمل اور علم و ہنر کی لگن کو اپنائیں۔ اقبال سائنسی اور علمی تحقیق کے بڑے حامی تھے لیکن مغربی سائنسی ترقی کے نتیجے میں جو معاشرہ وجود میں آیا تھا، اقبال اسے قابل اعتنا نہیں سمجھتے اور اس کی مذمت کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ اقبال جدت یا جدید تعلیم کے خلاف نہیں ہیں بلکہ وہ مغربیت یا مغرب زدگی کے خلاف ہیں۔ جدید مغربی تعلیم نے اپنے معاشرے کو جو سہولیات بہم پہنچائی ہیں، وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال مغرب کی علم دوستی کو تو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن وہ اس کی مادیت پرستی پر جرح کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی یہ رائے قابل توجہ ہے:''

''ان کے نزدیک جدیدیت معاشرتی زندگی کے بدلتے تقاضوں کی قبولیت کا عمل جب کہ مغربیت یا مغرب زدگی ایک غیر ملکی کلچر کو اپنی زندگی پر حاوی کرنے کا نام ہے۔ اپنی روایات اور اقدار سے وابستہ رہتے

---

[1] اقبال، مقالات اقبال (ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر) مرتبہ عبدالواحد معینی، ص ۱۷۳

ہوئے تبدیلی یا جدیدیت کو قبول کیا جا سکتا ہے''۔ [1]

اقبال کا پیغام ہے:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر [2]

اقبال کے نزدیک مغربی تعلیم کے مفاسد میں سے ایک بڑا فساد یہ ہے کہ یہ تعلیم ہمارے ولولہ انگیز ماضی سے ہمارا تعلق بالکل منقطع کر دیتی ہے۔ نتیجتاً جب ماضی سے رشتہ ختم ہو جائے تو ہدایت و رہبری کے امکانات بھی معدوم ہو جاتے ہیں یوں حال تو پریشان ہوتا ہی ہے مستقبل بھی ڈانواڈول ہو جاتا ہے۔ اقبال قرآنی تعلیمات کے مطابق تاریخ کے مطالعہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ قرآن مجید کے مطابق تاریخ کا مطالعہ قوم کی فکری نہج کو مثبت بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ یہ مطالعہ ان عوامل سے روشناس کراتا ہے جو قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کا سبب بنتے ہیں۔ اسی مطالعہ سے قوموں اور تہذیبوں کی پیدائش، موت اور زوال کے اسباب سامنے آتے ہیں۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب اور تعلیم درس دیتی ہے کہ ماضی کی روایات اور رشتوں سے منقطع ہو کر صرف حال اور مستقبل پر نظر رکھی جائے۔ یوں مغرب ماضی، حال اور مستقبل کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے تاریخ اور تاریخ کے مطالعہ کو فرسودہ قرار دیتا ہے۔

اقبال کے نزدیک تاریخ یہ بتاتی ہے کہ زندگی کی طرح انسانی علم بھی ایک ارتقائی و تدریجی عمل کا نام ہے۔ تاریخ ہی ان اصول و ضوابط کی نشاندہی کرتی ہے جن پر عمل کر کے اقوام نیکی و بدی کی راہیں متعین کرتی ہیں۔ اقبال اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ مغرب میں تاریخ کا وجود اہم سرچشمۂ علم نہیں ہے، اس لیے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ حال اور مستقبل کی تعمیر کے

---

[1] جاوید اقبال، ڈاکٹر، اقبال اور تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی اہمیت (مضمون)، مشمولہ: اقبال مشرق و مغرب کی نظر میں، مرتبہ سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ص ۱۰۹

[2] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۶۲۱

لیے ماضی سے نہ صرف رشتہ جوڑا جائے بلکہ اس میں بیان کی گئی حقیقت کو بھی بالغ نظری اور کھلے ذہن سے پرکھا جائے۔

بقول اقبال:

''واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اجتماعی حیثیت سے انسانی روح کی ایک حرکت ہے، انسانی روح کا کوئی ماحول نہیں بلکہ تمام عالم اس کا ماحول ہے اگر اسے کسی قوم کی ملکیت سمجھا جائے تو یہ تنگ نظری کا ثبوت ہے''۔ [1]

اسلامی نظریۂ تاریخ کے مطابق، تاریخ محض حکمرانوں اور بادشاہوں کے حالات زندگی اور کارناموں کے جاننے کا نام نہیں ہے اور نہ ہی اس کا مطالعہ کسی ایک ملک یا خطۂ ارضی کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ بلکہ اسے ایک تہذیب کی تاریخ کے طور پر سمجھا اور پڑھا جاتا ہے۔

اقبال مغربی تعلیم کے برعکس تاریخ کے تناظر میں انسان کی اہمیت کے قائل ہیں، ان کے نزدیک کائنات اور اس سے وابستہ تمام امکانات کی دلکشی اور رعنائی اسی کی بدولت ہے۔ اقبال زندگی کو ایک مسلسل ارتقائی عمل کا نام دیتے ہیں جب کہ تاریخ ان کے ہاں ایک فکری اور روحانی تسلسل کا نام ہے۔ یہ محض انسانی ذہن کو جلا دینے ہی کا کام نہیں کرتی بلکہ انسان میں اعتماد اور یقین کے اوصاف بھی پیدا کرتی ہے۔ [2]

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری، قصۂ جدید و قدیم [3]

مذہب بیزاری بھی مغربی تعلیم کا ایک منفی پہلو تھا جس پر اقبال نے کڑی تنقید کی ہے۔ ان کے نزدیک مغربی تعلیم کی بنیاد کیونکہ مادیت پرستی اور عقلیت پرستی کے غیر متوازن تصورات

---

[1] اقبال، گفتار اقبال، مرتبہ، رفیق افضل، ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۵۳

[2] وحید قریشی، ڈاکٹر، اساسیات اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۲۰۵

[3] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۵۳۸

پر ہے۔اس لیے بنیادی عقائد اور روحانی اقدار و روایات کی پاسبانی اس نظام تعلیم کی ترجیحات میں نہیں ہے۔ اقبال کو اندیشہ تھا کہ اس تعلیم کے زیر اثر مسلمان نوجوانوں کے عقائد بھی متزلزل ہو جائیں گے۔ اور وہ مغربی تعلیم و تہذیب کی اندھی تقلید میں اپنا نصب العین گنوا بیٹھیں گے۔ ان کے نزدیک مغربی تعلیم کی عطا کردہ بے دینی اور الحاد مسلمان نوجوانوں کو نہ صرف دین سے دُور کر دیں گے بلکہ ان میں احساس کمتری پیدا کر کے خاکبازی کی طرف راغب کر دیں گے۔ اس لیے اقبال روحانیت اور اخلاقیات کے لیے اسلام کی طرف دیکھتے ہیں، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مغربی تعلیم کے تناظر میں فکر اقبال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

> ''اقبال کی خواہش یہ تھی علم و فن یورپ سے حاصل کرو لیکن روحانیت اور اخلاقیات کا جو سرمایہ تم کو اسلام نے عطا کیا ہے، اس بیش بہا وراثت کی قدر کرو تا کہ تم شرق و غرب دونوں سے افضل اور مکمل تہذیب و تمدن پیدا کر سکو''۔ [1]

یہ کرب ناک حقیقت اقبال کے علم میں تھی کہ مغربی تعلیم نے نوجوانان ملت کو الحاد و بے دینی کی راہ پر لگا کر ان کی روح کو آلودہ کر دیا ہے۔ نوجوان اس تعلیم کے زیر اثر ظاہر پرستی اور ہوس زر میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ یوں ایسی نسل پروان چڑھ رہی ہے۔ جو کاروان ملت کی راہنما نہیں بلکہ راہزن ثابت ہو سکتی ہے۔ آج اقبال کی اس پیش گوئی کی صداقت ہمارے سامنے ہے جب ہم مغربی تعلیم یافتہ اور مغربی تہذیب کے رسیا اہل حکم کو ملک و ملت کے وقار اور آبرو کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

مغربی تعلیم نے جس انداز میں مذہبی اور اخلاقی اقدار کا جنازہ نکالا ہے، اس کی وضاحت اقبال بانگ درا کی ایک نظم میں یوں کرتے ہیں:

---

[1] خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، ص ۱۸۰

جب پیر فلک نے ورق ایام کا اُلٹا
آئی یہ صدا، پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی، طائرِ دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمیں تاز
مذہب سے ہم آہنگی افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے، جمعیتِ ملت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی
ظاہر ہے کہ انجامِ گلستاں کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز[1]

اقبال سمجھتے ہیں کہ مغربی تعلیم کی روح بلند اور ارفع مقاصد سے خالی ہے اور اس کا نصب العین صرف معاشی اور مادی منفعت کا حصول ہے۔ اس تعلیم کے نتیجے میں نوجوان تعلیم کا حصول صرف ڈگری کے لیے اور روزگار کے لیے کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک اس طرزِ تعلیم کی علمی سطح صرف مادہ پرستانہ اقدار کو فروغ دے کر اعلیٰ انسانی اقدار سے محروم کر رہی ہے۔ اقبال دیکھ رہے تھے کہ جدید مغربی تعلیم ایسے افراد کی تخلیق کا سبب بن رہی ہے جو اپنے بنیادی تشخص کے بارے میں تشکیک کا شکار ہیں۔

اقبال کے نزدیک مغربی تعلیم کی مذہب بیزاری اور مقصدیت سے محرومی درحقیقت اس تہذیب کے سیکولر رویے کی پیداوار ہے۔ انہیں اس بات کا بھی احتمال تھا کہ یہ رویہ مغرب کے

[1] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۲۷۵

زیر اثر اسلامی تہذیب کا حصّہ بھی بن سکتا ہے۔یعنی معاشرے میں مذہبی اور غیر مذہبی، دنیوی اور اخروی تقسیم۔،اسی ثنویت پر اقبال نے تنقید کی ہے۔اس حوالے سے وہ ترکی میں ہونے والی مذہب اور ریاست کی تقسیم کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور اسے اسلامی تعلیمات کے برعکس جان کر ہدف تنقید بناتے ہیں:

''دراصل ترک وطن پرستوں نے ریاست اور کلیسا کی تفریق کا اصول مغربی سیاست کی تاریخ افکار سے اخذ کیا——اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ترک وطن پرستوں کا نظریہ ریاست بڑا غلط اور گمراہ کن ہے کیونکہ اس کی رو سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اسلام کے اندر بھی کوئی ثنویت کام کر رہی ہے حالانکہ اسلام میں اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں''۔[1]

اسلام میں دین اور دنیا کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا گیا، اسلام میں دنیوی امور کا شمار بھی نیک اور اعلیٰ مقاصد میں ہوتا ہے۔ دنیوی اعمال بھی نیک نیتی سے سرانجام دیے جائیں تو یہ خود بخود دینی امور بن جاتے ہیں اور اگر ان کی انجام دہی میں نیک نیتی کا ظہور نہ ہو تو یہ غیر مذہبی اور باطل قرار پاتے ہیں۔گو اسلام میں اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔لیکن بعد ازاں مغرب کے زیر اثر اسلام میں بھی دین و دنیا کی تقسیم عمل میں آئی، مغربی فکر کے تحت سائنس، طب، انجینئرنگ وغیرہ کو دنیوی خانے میں ڈال دیا گیا یوں اسلامی تعلیم اور تہذیب و تمدن پر بہت برے اثرات مرتب ہوئے اور فلسفہ و سائنس کا مقام اسلامی تعلیمی نظام میں ہمیشہ کے لیے صحیح مقام سے نیچے گر گیا۔

حالانکہ بنیادی سائنسی علوم کے محقق اور داعی مسلمان ہی تھے۔لیکن وقت گزرنے کے ساتھ فکری جمود کے زیر اثر مسلمان سائنسی ترقی اور تحقیق میں بہت پیچھے رہ گئے یوں ان کی زندگی ہر شعبے میں علم کے فیض سے محروم ہوگئی۔اقبال کے سامنے مسلمانوں کی یہی کیفیت ہے

---

[1] اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، ص ۲۳۹، ۲۴۰

جوان کے لیے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی گذشتہ پانچ صدیوں کی علمی و عقلی غفلت نے انہیں ناقدانہ بصیرت سے دور کر دیا ہے اور وہ بدلتی ہوئی دنیا میں علمی و تحقیقی محرومی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔

اس رویے کے زیر اثر مسلمان نہ صرف اسلام کی حقیقی روح سے محروم ہوئے ہیں بلکہ وہ مادی ترقی کے ثمر سے بھی تہی دست ہیں۔ ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف اس پریشان کن صورت حال کا جائزہ یوں لیتی ہیں:

> ''مدت ہوئی مسلمانوں نے تحقیق و تخلیق کو چھوا تک نہیں۔ اس دوران جو علوم وفنون پیدا ہوئے ہیں کیا ان کو پڑھنا غیر اسلامی ہے؟ اگر ایسے علوم سے استفادہ کرنا عین سعادت ہے تو اسے بغیر اسلامی بنائے کیوں نہیں پڑھا جا سکتا؟ علم صرف علم ہے۔ لہٰذا اس پر اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کی قدغن نہیں لگنی چاہیے''۔ [1]

مغربی تعلیم کا ایک بڑا المیہ، عورت کو مامتا کے جذبے سے بیگانہ کرنا ہے۔ عورت اس تعلیم کے زیر اثر، نئی نسل کی تخلیق اور تعلیم و تربیت کے فرض اولین سے جان چھڑانے لگی ہے۔ حالانکہ یہ ذمہ داری قدرت کی طرف سے اسے سپرد کی گئی ہے۔ عورت کی طرف سے اس غفلت کا نتیجہ تہذیب و معاشرت کی بنیادی اکائی، خاندان کا شیرازہ بکھرنے کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ اقبال کے نزدیک بنی نوع انسان کی روحانی زندگی خاندانی وحدت ہی سے عبارت ہے۔ اور اگر یہ وحدت منتشر ہو جائے تو پورے معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب اور تعلیم نے عورت کو بے شمار بے جا پابندیوں سے آزاد کرایا ہے لیکن یہ کرم، بے اعتدالی کے باعث اس کے لیے ایک زحمت اور استبداد بن گیا ہے۔

---

[1] کنیز فاطمہ، ڈاکٹر، اقبال اور عصری مسائل، ص ۴۵۶

جس کی طرف خود مغربی مفکرین بھی برملا اشارہ کرتے ہوئے تشویش کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں معروف مغربی دانشور الیکس کیرل جدید تہذیب کے اس خطرناک رجحان پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> ''نسل کی بقا کے لیے صحت مند تولیدگی از بس ضروری ہے لیکن ہمارے ہاں جوں جوں تہذیب بڑھ رہی ہے تولیدگی کا مذاق اور معیار گرتا جا رہا ہے۔ عورتیں شراب اور تمباکو نوشی سے اپنی صحت برباد کر رہی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو دبلا پتلا دکھانے کے شوق میں غذا سے پرہیز کی ایک خطرناک راہ پر پڑی ہیں۔ یہ عیب ان میں موجودہ تعلیم کی بدولت اور تحریک نسواں کے پھیل جانے اور خودغرضی کا رجحان بڑھ جانے سے پیدا ہوا ہے''۔ [1]

مغربی تعلیم کے زیر اثر پیدا ہونے والی یہ صورت حال اس قدر گھمبیر ہے کہ اس نے پورے مغربی معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ عورت کی تقدیس اور احترام مخلوط تعلیمی نظام کی بنا پر ختم ہو کر رہ گئے ہیں۔ اقبال کے نزدیک عورت کی بے جا آزادی خود اس پر ظلم ہے۔ اقبال مغربی تعلیم پر تنقید کرتے ہیں تو ان کے نزدیک اس تعلیم کا یہ پہلو پورے معاشرتی و تہذیبی نظام کو تباہ کر دینے والا ہے۔ وہ عورت کو ضرورت سے زیادہ آزادی دینے کے قائل نہیں ہیں کہ یہ نہ صرف خلاف اسلام ہے بلکہ فطرت کے تقاضوں کے بھی برعکس ہے۔ اقبال کے نزدیک:

> ''جس قوم نے عورتوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی وہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنی غلطی پر پشیمان ہوئی ہے۔ عورت پر قدرت نے اپنی اہم ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں کہ اگر وہ ان سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے

---

[1] الیکس کیرل، انسان نامعلوم، بحوالہ اسرار و رموز پر ایک نظر از پروفیسر محمد عثمان، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۷۵، ۱۷۶

کی کوشش کرے تو اسے کسی دوسرے کام کی فرصت ہی نہیں مل سکتی۔ اگر اسے اس کے اصلی فرائض سے ہٹا کر ایسے کاموں پر لگایا جائے جنھیں مرد انجام دے سکتا ہے تو یہ طریق کار یقیناً غلط ہوگا مثلاً عورت کو جس کا اصل کام آئندہ نسل کی تربیت ہے، ٹائپسٹ یا کلرک بنا دینا نہ صرف قانون فطرت کی خلاف ورزی ہے بلکہ انسانی معاشرے کو درہم برہم کرنے کی افسوس ناک کوشش ہے''۔ [1]

فکر اقبال میں بیشتر مقامات پر مغربی تعلیم کے ہاتھوں عورت کے نسائی جوہر کی بربادی پر اظہار افسوس ہوا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری اور نثر ہر دونوں انداز میں مغربی رجحان کے اس خطرناک پہلو کا بصیرت افروز جائزہ لیا ہے۔ وہ آزادیٔ نسواں کے اس بڑھتے ہوئے رجحان کو نہ صرف تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ پورے معاشرے کے لیے تباہ کن بھی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مغرب کے ظلم وستم اور مظالم سے جہاں پوری دنیا شکوہ کناں ہے وہاں عورت اس کے استحصال کی سب سے بڑی شکار ہے۔ اقبال کے نزدیک عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہے وہ مرد کو اس کے اخراجات کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک عورت چراغ خانہ ہے نہ کہ شمع محفل۔

اقبال ایسی تعلیم موت کے مترادف قرار دیتے ہیں، جس سے عورت اپنی نسوانیت کا جوہر کھودے اور ماں کی خوبیوں سے محروم ہو جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے نہ صرف اس کا اخلاقی کردار ختم ہو جاتا ہے بلکہ پورا معاشرہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک پاکیزہ امومت سے محرومی نہ صرف عورت بلکہ تہذیب انسانی پر ظلم کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اسلامی تعلیمات کے پس منظر میں اس حوالے سے امومت کی اہمیت کے مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔

---

[1] فقیر عزیز الدین، روزگار فقیر، لائن آرٹ پریس، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۶۶

'رموزِ بے خودی' کے یہ اشعار قابلِ توجہ ہیں:

نیک اگر بینی امومت رحمت است
زانکہ او را با نبوت نسبت است
شفقتِ او شفقتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است
سیرتِ اقوام را صورت گر است
اَز امومت پختہ تر تعمیرِ ما
در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے
حرفِ امت نکتہ ہا دارد بسے
گفت آں مقصود حرفِ کن فکاں
زیرِ پائے امہات آمد جناں
ملت از تکریمِ ارحام است و بس
ورنہ کارِ زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتارِ حیات
از امومت کشفِ اسرارِ حیات
از امومت پیچ و تابِ جوے ما
موج و گرداب و حبابِ جوے ما[1]

مغربی تعلیم کے زیرِ اثر عورت کی بے راہ روی کس حد تک جا سکتی ہے، اس کا تذکرہ اقبال نے مغرب کی نسوانی تحریک کے تناظر میں کیا ہے۔ انھوں نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ یہ

[1] اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی، ص ۱۵۷

تحریک جو آزادیٔ نسواں کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے دراصل عورت کی نسوانیت کو تماشا اور اس کے جسم کو کھلونا بنا دینے والی ہے۔ وہ اس تحریک کی انتہا پسندی کا شاخسانہ عورت کے فرائض امومت سے پہلوتہی کی صورت میں دیکھ رہے تھے۔

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت [1]

اقبال اپنی فارسی شاعری کی تصنیف جاوید نامہ، میں فلک مریخ پر 'دوشیزہ مریخ'، کا احوال اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ایک ایسی عورت کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے جو مغربی تعلیم کے گمراہ کن بہکاوے میں آ کر اپنی نبوت کا دعویٰ کرتی ہے۔ یہ دوشیزہ مغرب کی تحریک آزادیٔ نسواں کی علمبردار ہے اور اس کا پیغام صنف نازک کو مرد کی غلامی سے آزادی دلانا ہے۔ اس کے مطابق اب نسل انسانی کا ارتقا مرد کے بغیر بھی جاری رہ سکے گا۔ حسب خواہش اولاد، لڑکا یا لڑکی پیدا کی جا سکے گی اور اسقاط حمل بھی عین دین ہوگا۔

اے زناں، اے مادراں، اے خواہراں
زیستن تا کے مثالِ دلبراں
اَز امومت زرد روے مادراں
اے خنک آزادیٔ بے شوہراں

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۶۰۸

آمد آں وقتے کہ از اعجازِ فن
می تواں دیدن جنین اندر بدن
حاصلے برداری از کشتِ حیات
ہرچہ خواہی از بنین و از بنات
گر نباشد بر مرادِ ما جنین
بے محابا کشتنِ او عین دین[1]

ڈاکٹر عبدالشکور احسن اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس دوشیزہ کی تقریر کی آڑ میں شاعر نے مغربی عورت کے کردار پر چوٹ کی ہے''۔[2]

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اسلام عورت کی آزادی، انفرادیت اور عظمت کا قائل ہے۔ اسلام نے عورت کو بھی وہی حقوق عطا کیے ہیں جو مرد کو ملے ہیں لیکن اسلام مرد اور عورت کے نفسیاتی اور جسمانی تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ حقیقت میں اسلام مرد اور عورت کی نفسیات اور استعداد و استطاعت کے مطابق آزادی اور مساوات کا قائل ہے۔ جب کہ مغربی تعلیم کے زیر اثر مغرب میں ملنے والی آزادیٔ نسواں تمام تر ذہنی و جسمانی تقاضوں کو نظر انداز کیے ہوئے ہے جو حقیقت میں فطرت کے عین خلاف ہے۔

مغرب میں پائی جانے والی اس غیر فطری آزادی اور مساوات کی لہر خود اہل مغرب کے دانشوروں کو بھی پریشان کیے ہوئے ہے۔ وہ سائنسی نقطۂ نگاہ سے مرد اور عورت کی استعداد اور استطاعت کا جائزہ لیتے ہیں تو برملا کہہ اٹھتے ہیں، اس سلسلے میں نوبل انعام یافتہ سائنس دان

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، فارسی، ص ۵۸۳، ۵۸۴

[2] عبدالشکور احسن، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۱

الیکس کیرل رقم طراز ہے:

''نوجوان لڑکیوں کو ویسی ہی ذہنی اور جسمانی تربیت اور ویسی ہی آرزوئیں نہیں ملنی چاہیں جیسی کہ لڑکوں کو دی جاتی ہیں۔ تعلیم دینے والوں کا فرض ہے کہ مرد اور عورت کے ذہنی اور بدنی کوائف میں جو فرق ہے اس کو ملحوظ خاطر رکھیں اور اس کے فطری تقاضوں کو سمجھیں۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان کبھی نہ مٹنے والے اختلافات موجود ہیں اور نہایت ہی ضروری ہے کہ مہذب دنیا کی تعمیر نو میں ان کا پورا پورا خیال رکھا جائے''۔ [1]

اسلام نے اسی جسمانی اور نفسیاتی فرق کی طرف بہت پہلے اشارہ کر دیا تھا۔ اس حوالے سے اسلام عورت اور مرد کو معاشرتی و تہذیبی اغراض میں ایک دوسرے پر انحصار اور مدد کی تعلیم دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک بھی عورت اور مرد کی صلاحتیں ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث ہیں۔ وہ تہذیب و تمدن کی تکمیل کے لیے دونوں کے وجود کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تہذیبی ارتقا کے لیے ہر دو اپنے اپنے فرائض اور ذمہ داری کو اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے سرانجام دیں۔ اقبال عورت کی تعلیم کے بھی اتنے ہی خواہش مند ہیں جتنا وہ مرد کی تعلیم کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ تہذیب و تمدن کی بہتری اور نشو و نما کے لیے مرد و خواتین کی تعلیم کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ البتہ اس ضمن میں احتیاط کے متقاضی ہیں کہ خواتین کو ایسے علوم اور مضامین پڑھائے جائیں جن سے ان کی نسوانیت اور دین متاثر نہ ہو، وہ مسلمان بچیوں کے لیے مذہبی تعلیم کو بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کی تعلیم ایک پورے خاندان کی تعلیم ہے۔ اس لیے اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال اس حوالے سے لکھتے ہیں:

---

[1] الیکس کیرل، انسان نامعلوم، بحوالہ اسرار و رموز پر ایک نظر از پروفیسر محمد عثمان، ص ۱۷۵

''پس ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فرد واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اگر اس قوم کا آدھا حصّہ مطلق جاہل رہ جائے''۔ [1]

اقبال جہاں عورت پر مغربی تعلیم و افکار کے اثرات سے پیدا ہونے والے نفسیاتی و روحانی مسائل سے فکر مند تھے، وہاں وہ مسلمان معاشرے میں عورت کے حوالے سے برتی جانے والی غفلت سے بھی پریشان تھے۔ اس کے باوجود اقبال اس بات پر مطمئن تھے کہ تمام تر ناانصافیوں اور غفلت کے باوصف مسلمان عورت کسی نہ کسی طرح اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برا ہوتی رہی ہے اور اس کی اس وفاداری، برداشت اور عظمت کے پس منظر میں اس کی مذہبی اور تہذیبی تعلیم کارفرما رہی ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

''میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی قوم کی بہترین روایات کا تحفظ بہت حد تک اس قوم کی عورتیں ہی کر سکتی ہیں ـــــ اگرچہ انحطاط کے دور میں عورت کے حقوق سے بے پروائی ہوئی۔ مسلمان مردوں نے مسلمان عورتوں سے تغافل برتا لیکن عورت باوجود اس تغافل کے اپنا منصب پورا کرتی رہی''۔ [2]

دراصل مغربی تعلیم کے برعکس، اقبال کے نزدیک امت مسلمہ کی راہنمائی اور تقلید کے لیے، نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ کی شکل میں کامل نمونہ موجود ہے اور وہ اسی حوالے سے عورت کو بھی تلقین و ہدایت کرتے ہیں کہ وہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی پیروی کرے

---

[1] اقبال، مقالاتِ اقبال (قومی زندگی) مرتبہ عبدالواحد معینی، ص ۹۴

[2] اقبال، مقالاتِ اقبال (شریعتِ اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ) مرتبہ: عبدالواحد معینی، ص ۳۲۱

اور اسی نسبت سے اپنی آغوش میں ایسے بچوں کی پرورش کرے جو صفات میں امام عالی مقام حضرت حسینؓ سے فیض یاب ہوں۔ رموزِ بے خودی میں سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ کے اسوہ کو مسلمان خواتین کے لیے راہنما قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

مریمؓ از یک نسبتِ عیسیٰؑ عزیز
از سہ نسبت حضرتِ زہراؓ عزیز
سیرتِ فرزند ہا از امہات
جوہرِ صدق و صفا از امہات
مزرع تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
نوری وہم آتشی فرمانبرش
گم رضایش در رضائے شوہرش
آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گرداں و لبِ قرآں سرا

اقبال، آپؓ سے عقیدت و محبت کے پیرائے میں مزید کہتے ہیں:

رشتۂ آئینِ حق زنجیر پاست
پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفیٰ ﷺ است
ورنہ گردِ تربتش گردیدمے
سجدہ ہا بر خاکِ او پاشیدمے [1]

اقبال کے نزدیک مغرب کا نظامِ تعلیم دین و مروت کے خلاف ایک سازش کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے تحت قائم کردہ مکاتب میں مادیت پرستی اور الحاد کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، فارسی، ص ۱۵۹، ۱۶۰

مغربی فلسفۂ تعلیم شاہین بچوں کو کرگس صفات بنا رہا ہے۔ اقبال خداوندان مکتب اور اہل مدرسہ سے سخت نالاں ہیں جو روحانیت کا گلہ گھونٹ کر لا الٰہ کی صدا سے محروم کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ نظام تعلیم بے یقینی کی زندگی کو پروان چڑھا رہا ہے۔

اقبال ایک ایسے نظام تعلیم کے خواہاں ہیں جو نہ صرف فرد کی بلکہ پوری قوم کی خودی کی تربیت کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ ان کا فلسفۂ تعلیم حقیقت میں ان کے فلسفۂ خودی کے تابع ہے، وہ خودی کی نشوونما کو تعلیم کا اصل مقصد گردانتے ہیں۔ اقبال مغربی نظام تعلیم کے اس لیے بھی ناقد ہیں کہ اس میں خودی کی نشوونما کی طرف بالکل توجہ نہیں دی گئی جب کہ زندگی نام ہی خودی کے احساس کا ہے۔ اپنے ماحول کو جاننا اور معرفت الٰہی کا ادراک کرنا، یہ سب خودی ہی کا مرہون منت ہے۔ اس لیے اقبال کے نزدیک 'احساس نفس' ہی مقصد اولین ہے لیکن افسوس مشرق و مغرب دونوں ہی اس راز سے ناواقف ہیں۔

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام[1]

طاہر فاروقی تصوراتِ اقبال میں خودی کے مرکزی مقام کی وضاحت مغربی تہذیب اور نظام تعلیم کے تناظر میں یوں کرتے ہیں:

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۵۹۳، ۵۹۴

''موجودہ تہذیب وتمدن نے ہم کو اسرار خودی سے بہت دور کر رکھا ہے لیکن اگر خودی نہیں تو یہ نعمت وجاہ یہ شکوہ سروری اور یہ دنیا سب ہیچ ہے''۔ [1]

اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''اقوام عالم ان رموز سے بے خبر ہونے کی بدولت ان چیزوں کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہیں، جو ان کو راہ راست سے بھٹکاتی ہیں۔ اگر خودی نہیں تو تمام دنیوی علوم وفنون بیکار ہیں''۔ [2]

ایک مذہبی معاشرے کی پہچان، افراد کی خوش اخلاقی، سچائی اور دیانت داری پر منحصر ہے۔ دنیا میں ایسے معاشرے ہی قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، جن کے افراد اخلاقی طور پر پختہ کار ہوں۔ ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف اس حوالے سے چین کی مثال دیتی ہیں کہ چین ایسا ملک ہے جہاں افراد نہ شان وشوکت رکھتے ہیں، اور نہ پرشکوہ طرز حیات اختیار کیے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ملک اقوام عالم میں قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہاں کے افراد کی سچائی، دیانت داری اور خوش اخلاقی ہے۔ ہر فرد اپنے فرض کی ادائیگی میں پوری لگن اور دیانت سے کام لیتا ہے۔ جھوٹ اور دھوکہ بازی اس قوم کے خمیر ہی میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قوم اقوام عالم میں غیرت اور خوداعتمادی کی مثال ہے۔ [3]

ایک وقت تھا جب مسلمان بھی خوداعتمادی اور اخلاق کی بلندیوں پر فائز تھے۔ آخر کیا چیز ہے جو قوموں کو احساس، دیانتداری اور نظم عطا کرتی ہے۔ آج ہمارا معاشرہ صداقت اور خود اعتمادی کے اوصاف سے عاری کیوں ہے؟ اس کا جواب، نظام تعلیم کا خودی کی تربیت سے بیگانہ ہونا ہے۔ اسی بنا پر شخصیت کی تعمیر کا کام ادھورا ہے۔ افراد مقصد حیات سے ناواقف

---

[1] طاہر فاروقی، پروفیسر، سیرت اقبال، گوہر پبلی کیشنز لاہور، س ن، ص ۲۷۵

[2] ایضاً، ص ۲۷۴

[3] کنیز فاطمہ، ڈاکٹر، اقبال اور عصری مسائل، ص ۴۵۱

ہیں۔ تعلیم و تربیت کا نظام ادھورا اور غلط مفروضات پر استوار ہے، جس کی بنا پر تخلیقی بلندی تو کیا افراد تعمیر کی ابتدائی سوجھ بوجھ سے بھی محروم ہیں۔ اور جب ایسے افراد اہم فیصلے کرنے کے منصب پر فائز ہوں تو قوم و ملت کا انحطاط لازم ہے۔

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
خودی ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل [1]

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ [2]

ڈاکٹر سید عبداللہ، اقبال کے نظریۂ تعلیم میں خودی کی اہمیت اور اس کے تربیتی نظام کے حوالے سے وضاحت کرتے ہیں:

''اقبال نے اپنے نظریۂ تعلیم میں طریق کار کا سلسلہ تربیت خودی پر مبنی کیا ہے۔ خودی کی تربیت کے لیے ایک ایسا نظام درکار ہے جس میں کلیت پائی جائے، جس میں حواس کی تربیت، وجدان اور جذبے کی تربیت کا پہلو بھی ہو اور ان روحانی رشتوں کا احساس بھی جو نفس انسانی میں قدرت کی طرف سے پائے جاتے ہیں''۔ [3]

اس طرح اقبال ایک ایسے تعلیمی نظام کے متلاشی ہیں جو نہ صرف خودی کی تربیت کرے

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۳۹۱
[2] ایضاً، ص ۶۱۲
[3] عبداللہ، ڈاکٹر، طیف اقبال، مرتبہ، ممتاز منگلوری، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۱۴۰

بلکہ اسے استحکام بھی بخشے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال ایسے نظام تعلیم کو رد کرتے ہیں اور نقصان دہ سمجھتے ہیں جو خودی کی تربیت سے لاتعلق ہو۔ اقبال کے معیار پر جو تعلیم پوری اترتی ہے، وہ تعلیم کیا ہوسکتی ہے؟ اس کی وضاحت اقبال نے خواجہ غلام السیدین کے نام اپنے ایک خط میں یوں کی ہے:

''علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انھی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ یہ علم، علم حق کی ابتدا ہے جیسا کہ میں نے **جاوید نامہ** میں کہا ہے:

علمِ حق اول حواس، آخر حضور
آخرِ او می نگنجد در شعور

وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا اور جو علم کی آخری منزل ہے، اس کا نام عشق ہے۔ علم و عشق کے تعلق میں **جاوید نامہ** میں کئی اشعار ہیں۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں

مسلمان کو لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو جس کا دارومدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت حاصل ہوتی ہے) مسلمان کرے ''بولہب را حیدر کرّار کن'' اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو بنی نوع انسان کے لیے سراسر رحمت ہے''۔ [1]

---

[1] اقبال، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال (جلد: چہارم)، مرتبہ: سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۴۴

اس طرح علم کے حصول کے دو ذرائع سامنے آتے ہیں۔ ایک علم حواس اور عقل کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے جبکہ دوسرا علم ایمان اور وجدان کے ذریعے میسر آتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ دونوں باہم متصادم نہیں ہیں بلکہ ان دونوں کا ارتباط ضروری ہے۔ یوں یہ دونوں مل کر ایک صحیح نظامِ تعلیم کے مرتب کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر طاغوتی علم ہے جو انسان کو سرکشی اور خودسری کی تعلیم دیتا ہے اور انسانیت کے لیے بجائے مفید ہونے کے الٹا ضرررساں ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس لاہوتی اور وجدانی علم انسان کو غلط راستے سے بچاتا ہے اور انسانیت کی فلاح و بہبود میں معاون بنتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ روحانیت سے بے بہرہ علم بے فائدہ ہے اور انسانیت کی خدمت کی بجائے اس کی تخریب میں کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے برعکس روحانیت پر مبنی علم انسانیت کے لیے خدا کی رحمت ہوتا ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک دینی تعلیم بھی اتنی ہی ضروری ہے، جس قدر دنیوی تعلیم اہمیت رکھتی ہے۔ اقبال ان دونوں کے درمیان ربط اور تعلق کے بھی قائل ہیں۔ ان کے نزدیک محض دینی یا صرف دنیوی تعلیم کافی نہیں ہے اور نہ انہیں علیحدہ علیحدہ کر کے بہتر نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اقبال کے مطابق قدیم طرز کی دینی درسگاہوں اور جدید انداز کی مغربی درسگاہوں کا یہی نقص رہا ہے کہ ان میں سے اول الذکر دنیا اور اس کے حالات و واقعات سے بے بہرہ اور لاتعلق ہے جب کہ ثانی الذکر نے صرف دنیا ہی کو اپنا مقصود و منتہا سمجھ لیا ہے۔ نتیجتاً دینی تعلیم کا عملی دنیا سے اور مغربی تعلیم کا روحانیت سے ناتا منقطع ہو گیا ہے۔

مغرب کی روحانیت اور دینی تعلیم سے دوری نے معاشرے میں جس انتشار اور بے یقینی کی فضا کو مسلط کیا ہے، اس طرف اشارہ کرتے ہوئے حنیف رامے لکھتے ہیں:

> ''مغرب نے سائنسی علوم کے مقابلے میں انسانیاتی علوم کو نظر انداز کر کے جس طرح کی بے روح اور سفاک مشینی معاشرت کو جنم دیا ہے۔

اس میں انسانیت اور روحانی قدروں کا دم گھٹتا جا رہا ہے۔۔۔اہلِ مغرب کے پاس علم تو ہے لیکن انہیں شعور نہیں کہ ان کے اندر خدا نے اپنی روح پھونک رکھی ہے۔ اصل میں مغرب خصوصاً یورپ اور امریکہ میں اپنے اندر روح کی موجودگی کا شعور تو کیا ہونا تھا ان کے نزدیک تو خدا ہی مر چکا ہے''۔ [1]

اقبال کے نزدیک دین اور جدید سائنس دو مختلف اور الگ الگ مضمون نہیں ہیں بلکہ ایک ہی مضمون کے دو حصّے ہیں۔قرآن مجید نے مسلمانوں کو بار بار تلقین کی ہے کہ وہ مطالعہ کائنات اور تسخیر کائنات کی طرف متوجہ ہوں۔ اقبال کے خیال میں، دینی علوم، خدا، کائنات اور انسان تینوں کے مجموعی تشخص پر مشتمل ہیں۔ اسی خیال کے زیر اثر اقبال ایک ایسے نظام تعلیم کی بات کرتے ہیں جس میں دین، سائنس اور حکمت کو ایک واحد مضمون کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے۔ان کے خیال میں دین، عقل اور تجربے کے ملاپ سے انسان پر حقیقت کے در وا ہو سکتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا نظام تعلیم دینی اور سائنسی علوم کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔اسی تناظر میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''غرض اقبال حکمت وفلسفہ کے باب میں ایک طرف سائنسی فلسفیوں کے ہم خیال ہیں جو فلسفے کے تصورات کو سائنس کے تجربات وانکشافات سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف عینی (آئیڈلسٹ) فلسفیوں کے ہم رائے ہیں، جو علم کے مقابلے میں محض تعقل کو کافی نہیں سمجھتے اور ایک برتر سرچشمۂ علم کی ضرورت کو ناگزیر خیال کرتے ہیں۔ یہی نقطۂ نظر خالص سائنسی طریقہ کار کے متعلق ہے کیونکہ وہ سائنس کو بھی ناکافی خیال

---

[1] حنیف رامے، اسلام کی روحانی قدریں ''موت نہیں زندگی''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۴۱۰

کرتے ہیں۔ اس لیے کہ سائنس تجربی سلسلہ عمل سے قدم آگے نہیں بڑھا سکتی۔ اس لیے بھی تعقل اور ایمان دونوں کی ضرورت ہے''۔ [1]

تعقل اور ایمان کی ہم آہنگی ہی علم میں وسعت کے امکانات روشن کرتی ہے۔ علم میں وسعت کا فقدان اس کی اہمیت کو ختم کر دینے کے مترادف ہے۔ علم میں تحقیق و جستجو اور نئے تجربات کی مدد سے ہمہ وقت ردوا ختیار کے در وا ہیں تو وسعت اور جدید یت، علم میں نئی صورتیں جنم دیتی ہیں۔ تحقیق کا عمل کسی بھی علم کی نشوونما اور ارتقا میں آکسیجن کی اہمیت رکھتا ہے۔ تحقیق سے مزئین علم ہی کسی قوم کے مستقبل کو سنوارنے میں معاون ہوتا ہے۔ آزادیٔ فکر اور تجدید علم ایسی صفات ہیں جو قوموں کو تقلید کی روش سے دور رکھتی ہیں۔ جب کہ تقلید ذہنی غلامی کے ساتھ معاشی اور سیاسی غلامی بھی، قوموں کا مقدر بنا دیتی ہے۔

آج مسلمان علمی لحاظ سے پسماندہ ہیں، ان کے علوم تحقیق و نئے تجربات کی آگہی سے بے بہرہ ہیں۔ نتیجتاً ذہنی غلامی ان کا مقدر ہے۔ اور اس ذہنی غلامی کی ذریات معاشی و سیاسی غلامی، نے ان کی رہی سہی فکری استعداد کا بھی جنازہ نکال دیا ہے۔ ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف موجودہ دور میں فکرِ اسلامی میں تحقیق و جستجو کی اہمیت کے پیش نظر لکھتی ہیں:

''تحقیق و تخلیق کے ذریعے مغرب نے سائنس میں ترقی کی انتھک کوشش اور فکری مخالفت و مخاصمت کی مدد سے اپنے ماحول پر قابو پانے کے طریقے دریافت کیے۔ آج مغرب کے دانشور یہ کہتے ہیں کہ جو ہم تصور کر سکتے ہیں، بنا بھی سکتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں تحقیق و تخلیق کے سوتے خشک ہو گئے۔ تنگ نظری اور کوتاہ بینی فکری ارتقا میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ جب اختراع اور ایجاد کو قبولیت اور تحسین

---

[1] عبداللہ، ڈاکٹر، مقاماتِ اقبال، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۳۲۸

کے دائرے سے نکال دیا جائے اور نئی روش کے اساتذہ اور نئی ایجادات کے موجد کی بے حرمتی کی جائے تو انفرادی استعداد اور قابلیت منجمد ہو جاتی ہے۔ انفرادی آزادی قومی آزادی کا حصّہ ہے۔ قوموں کی تقدیر بھی ایسے افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے جن کی فکری قوت زمان و مکاں کی قوتوں کو تسخیر کر سکتی ہے''۔ [1]

ماضی کی بنیاد پر بات کی جائے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ سائنسی ارتقا میں مسلمانوں کا حصّہ کچھ کم نہیں ہے۔ اس کی وجہ متقدمین کا علوم کو اسلامی اور غیر اسلامی میں تقسیم نہ کرنا تھا۔ ماضی میں مسلمانوں نے آزادانہ اپنی فکری و ذہنی صلاحیتوں کا استعمال کیا۔ علم کو علم کی بنیاد پر حاصل کیا نہ کہ مذہبی اور غیر مذہبی خانوں میں بانٹا۔ اس کے نتیجے میں تحقیق و تخلیق کے امکانات نہ صرف روشن رہے بلکہ ان میں برابر وسعت پیدا ہوتی رہی۔ اقبال مذہب، فلسفہ، طبیعیات اور دیگر علوم و فنون کو ایسے مختلف راستے قرار دیتے ہیں جن کی منزل مقصود ایک ہی ہے۔

اقبال کے نزدیک مذہب اور سائنس میں تصادم کا خیال سراسر غیر اسلامی ہے کیونکہ سائنس یعنی علوم جدیدہ کے باب کھولنے والے مسلمان ہی ہیں، جنھوں نے علوم کی بنیاد نظریات و قیاسات پر رکھنے کے طریقے کو رد کیا اور اسی نتیجے میں علوم جدیدہ کی پیدائش عمل میں آئی۔ لیکن اقبال اس حقیقت سے بھی باخبر ہیں کہ گذشتہ پانچ صدیوں سے اہل اسلام پر جمود طاری ہے اور اس دوران میں مغرب مسلسل فکری ارتقا کی جانب گامزن رہا ہے۔ اس دوران میں اس نے اپنی قوت تخلیق اور روح ایجاد کی بدولت تسخیر کائنات کے خواب کو حقیقت کا روپ دے دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب کی موجودہ بالادستی کوئی اتفاقیہ امر نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے اسلامی تہذیب کی علمی و فکری ترقی کارفرما ہے:

---

[1] کنیز فاطمہ یوسف، ڈاکٹر، اقبال اور عصری مسائل، ص ۴۵۴

''مغربی تہذیب کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس سے اسلامی تہذیب و ثقافت کے فیصلہ کن اثرات کا پتہ نہ چلے''۔ [1]

اقبال کے تصورِ تعلیم میں تاریخ اور روایات کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ، انسانی کردار کی تعمیر، ملت کی تنظیم اور حقائق کی آگہی کا بہت موثر ذریعہ ہے۔ ان کے نزدیک جو اقوام اپنی تاریخ اور روایات سے بیگانہ رہتی ہیں وہ تاریخ میں اپنی شناخت کھو بیٹھتی ہیں۔ قرآن مجید نے علم کے جو تین ذرائع بتائے ہیں ان میں سے ایک ذریعہ تاریخ ہے۔ قرآن مجید بار بار زمین کی سیر کی تاکید کرتا ہے اور گزری ہوئی داستانوں اور بیتے ہوئے واقعات کو علم و شعور کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق تاریخ ایام اللہ ہے اور انسانی علم و بصیرت کا ایک سرچشمہ ہے۔ اقبال کے نزدیک:

''اس سے بڑی غلط بیانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن پاک میں کوئی ایسا خیال موجود نہیں جو فلسفہ تاریخ کا سرچشمہ بن سکے۔ حالانکہ بہ نگاہ حقیقت دیکھا جائے تو ابن خلدون کا مقدمہ سرتاسر اس سے معمور ہے، جو قرآن مجید کی بدولت اس میں پیدا ہوئی، وہ اقوام و امم کے عادات و خصائل پر حکم لگاتا ہے تو اس میں بھی زیادہ تر قرآن پاک ہی سے استفادہ کرتا ہے''۔ [2]

ایک فرد کی زندگی میں جو مقام و مرتبہ اس کے حافظہ کو حاصل ہے وہی مقام قوم کی زندگی میں اس کی تاریخ کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال تاریخ کی اہمیت کے پیش نظر، تعلیم میں تاریخ کے مطالعہ پر خاص زور دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر تاریخ کی سرگزشت قوموں کی زندگی سے محو ہو جائے تو وہ اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں۔ حقیقت میں اقوام اپنی تاریخ سے روشنی کشید کرتی

---

[1] اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، ص ۲۰۰

[2] ایضاً، ص ۲۱۳

ہیں اور ان کی روایات کی یادیں ان میں خودشناسی کے جوہر پیدا کرتی ہیں اور فرد کو مرد کار اور مرد راہ بناتی ہیں۔ تاریخ، روحِ ملت کے لیے سرمایہ اور قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسا دل افروز اور دل پذیر ساز ہے جس کے تاروں میں گذشتہ نغمے اسیر ہو جاتے ہیں۔

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو
دوش را پیوند با امروز کن
زندگی را مرغ دست آموز کن
رشتۂ ایام را آور بدست
ورنہ گردی روز کور و شب پرست
سر زند از ماضیٔ تو حال تو
خیزد از حالِ تو استقبالِ تو
مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال
موجِ ادراک تسلسلِ زندگی است
مے کشاں را شور قلقل زندگی است[1]

اسلامی تاریخ وتہذیب میں وحدت انسانی کا تصور فلسفیانہ اور شاعرانہ نہیں بلکہ یہ روزمرہ زندگی کا فعال عنصر ہے۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب وحدت انسانی کا مجرد تصور رکھتی ہے جو جارحانہ وطن پرستی کے باعث وحدت انسانی میں نہیں ڈھل سکا ہے۔ گو مغرب آفاقی تہذیب اور انسانی وحدت کے نام پر اپنی سامراجی گرفت تو مضبوط کر رہا ہے لیکن اس کے ہاں پایا جانے والا انسانی وحدت کا تصور، وحدت انسانی کے آفاقی تصور سے کوئی میل نہیں رکھتا۔

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، فارسی، ص ۱۵۶

مغرب وحدت انسانی کے تصور کو اپنی ملوکانہ آفاقیت اور سامراجی جمہوریت کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ موجودہ دور میں فوکویاما کا نظریہ تاریخ کا خاتمہ اور ہنٹنگٹن کا تہذیبوں کا تصادم کا نظریہ اور اس کے نتیجے میں ملوکانہ عالمی و آفاقی تہذیب اور عالمی نظام یعنی نیو ورلڈ آرڈر کا نظریہ اس کا واضح عکاس ہے۔

اقبال کے نزدیک تاریخ، انسانوں، قوموں اور تہذیبوں کے نظری تجزیے کے ساتھ خارجی تجزیے کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے، جس کے نتیجے میں اجتماعیت اور وحدت انسانی کا نظریہ جنم لیتا ہے۔ قرآن مجید میں وحدت انسانی کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے کہ "اور ہم نے تمہیں نفس واحد سے پیدا کیا ہے" یہ انسانی مساوات کا وہ تصور ہے جو کسی اور تہذیب میں اس درجے پر نہیں ملتا۔ ڈاکٹر راشد حمید اس کی بنیادی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مسلم تہذیب کے زیر اثر تاریخ پر تصور تاریخ کو فوقیت رہی ہے۔ اس بنا پر معاشرے میں عدل و مساوات اور اخوت کا ماحول قائم رہا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "ظہور اسلام کے بعد مسلم معاشروں اور مسلم تہذیب کے اندر تصور تاریخ کے فکری تناظر میں جو فکری تسلسل رہا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ تاریخ پر تصور تاریخ کو جو فوقیت حاصل رہی ہے، اس کی بنیاد پر یہ معاشرہ، اس شکست و ریخت کے عمل سے نہیں گزرا، جہاں پہنچ کر انسانی رویے، حیوانی رویوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور انسان کی احسن التقویمی صورت اسفل السافلین کے درجے پر اتر کر گم ہو جاتی ہے اور معاشرے میں عدل کا وہ نظام ختم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے کالے، گورے، امیر، غریب، بڑے، چھوٹے کی تمیز، اسلام نے ختم کی تھی اور جو مساوات اور اخوت کا درس دیا تھا، وہ اپنے ماحول میں

قائم رہ سکتا ہے''۔ [1]

تاریخ کے دو مختلف پہلو ہیں، عمل تاریخ اور تصور تاریخ، تصور تاریخ اسلام کے روحانی نظام سے ہم آہنگ ہے، جب کہ عمل تاریخ مادی رویوں کا عکاس ہوتا ہے۔ تصور تاریخ کا روحانیت سے تعلق اسے صراط مستقیم سے ہم آہنگ کرتا ہے جب کہ تاریخ کے مادی رویوں سے منسلک ہونے سے ایسے زاویہ ہائے فکر جنم لیتے ہیں، جن کی بنا پر اس فکر یا علم کا سفر سچائی کے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔

اقبال کے ہاں نظام تعلیم کے ضمن میں مختلف فنون اور ادبیات کے معیار سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس حوالے سے 'ضرب کلیم' میں ایک علیحدہ عنوان کے تحت اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک وہی فن درست ہے جو قوت حیات کا ترجمان ہو اور خودی کی نشوونما میں معاون ہو۔ جو ادب یا فن اس معیار پر پورا نہیں اُترتا، وہ ان کے نزدیک ضعیف فن ہے۔ فکر اقبال میں مختلف فنون اور ادبیات کے مقام و مرتبے کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''اقبال ان مفکرین میں سے نہیں جو ادب کو صرف تخیلی سمجھ کر ٹھکرا دیتے ہیں۔ اقبال اپنی اسی ذہنی کلیت کی وجہ سے تخیل کو، جو ادب اور فنون لطیفہ کی بنیاد ہے، انسانی زندگی کا جزو خیال کرتے ہیں اور اسے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس میں تخلیق کا عمل، ارتقا کو فائدہ پہنچانے والا عمل ہے۔ خداوند تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت احسن الخالقین ہے۔ انسانی سطح پر تخلیق کرنے والے بھی اچھے لوگ ہیں اور ادیب کا تخلیقی عمل نافع اور فائدہ مند عمل ہے مگر ادب پر انھوں نے تنقید، خودی کے نقطۂ نظر سے کی ہے۔ ان کے نزدیک صحیح ادب وہ ہے جو زندگی کی آرزو پیدا کرے اور مقاصد کی لگن کی شمع کو روشن رکھے۔ وہ ادب جو ترقی پذیر ہے اور ارتقائے انسانی

---

[1] راشد حمید، ڈاکٹر، اقبال کا تصور تاریخ، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۹۲

کی مہم میں انسان کے لیے مدد و معاون ہے، اسے وہ بڑا مقام دیتے ہیں۔
جو ادب افسردگی پیدا کرے، طبیعت میں پست حوصلگی پیدا کرے، جو
نوائے غم اور موت کا علمبردار ہو جائے یا جو محض تصنع یا جھوٹ اور سٹائل پر
ہی ختم ہو جائے، اقبال اس کے خلاف ہیں''۔ [1]

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظام تعلیم کے حوالے سے اقبال جو تصورات رکھتے ہیں، ان سے انسانی سیرت و کردار کی تعمیر و پختگی کے ساتھ، خدا، کائنات اور انسان کو ایک کلی نظام کی شکل میں دیکھنا بھی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک محض مادی یا محض روحانی تعلیم کا حصول ہی مقصود نہیں ہے۔ بلکہ روح اور مادہ کا ایک ایسا امتزاج ان کے پیش نظر ہے، جو جسم اور روح دونوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھے۔ اس کے ساتھ ہی تسخیر کائنات بھی تعلیم کا اولین مقصد ہو، جس کے تحت وہ کائنات کی وسعتوں کو کھنگال کر انسان کے مقصد تخلیق کو حاصل کر سکے۔ اقبال ایسے نظام تعلیم کو پسند کرتے ہیں جو افراد کی خودی بیدار کر کے انہیں معاشرے کے لیے مفید شہری بنائے، یوں ایک ایسے صالح معاشرے کی بنیاد رکھی جائے جہاں اخوت و مساوات، رواداری اور محبت کا دور دورہ ہو۔ حقیقت میں اقبال کا تصور تعلیم ایک ایسے معاشرے کی تخلیق کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ جو آفاقی تہذیب کے تصور کو پروان چڑھا سکے کہ یہی مقصودِ فطرت ہے اور یہی رمزِ مسلمانی ہے۔

❑❑❑

[1] عبداللہ، سید ڈاکٹر، طیف اقبال، ص ۱۷۱

باب چہارم

وطنیت وقومیت کا مغربی تصور اور اقبال

جدید مغربی تہذیب کی ایک خصوصیت، جس کی بنا پر اقبال نے اس تہذیب کو ہدف تنقید بنایا ہے، وطن وقوم پرستی بھی ہے۔ جدید مغربی سیاسی افکار میں وطنیت اور قومیت کا تصور قریب قریب ایک ہی معنی رکھتا ہے۔ اقبال وطنیت کے سیاسی نظریے کو جس بنا پر رد کرتے ہیں، وہ وجہ مغرب کا سیاسی نظریہ پر مبنی وطنیت کا تصور ہے۔ مغرب میں وطنیت کے تصور کی بنیاد سیکولرازم پر ہے، جو مذہب اور اخلاق سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب نے مذہب کی کمی وطنیت کے تصور سے پوری کی۔ یہ تصور ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے قطعاً غیر انسانی اقدار پر مشتمل ہے اور اس کی بنیاد پر ایک انسانی گروہ دوسرے انسانی گروہ سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔

انسانوں کی یہ لاتعلقی بالآخر باہمی مناقشات اور تنازعات کو جنم دیتی ہے، جس میں بے شمار قیمتی جانوں کا نقصان اور بلاخیز تباہی انسان کا مقدر بنتی ہے۔ اقبال مغرب کی اس رہبانیت پر مبنی تاریخ، جو آخر کار وطنیت کے سیاسی تصور پر منتج ہوئی، کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یورپ میں عیسائیت کو خالصتاً راہبانہ نظام تصور کیا جاتا تھا جو بتدریج ترقی پا کر ایک بہت بڑی کلیسائی تنظیم بن گیا—— اس تنظیم کے خلاف لوتھر کی بغاوت بالکل جائز تھی۔ اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے یہ محسوس نہیں کیا کہ ان مخصوص حالات میں جو اس وقت یورپ میں موجود تھے، اس کی بغاوت کا مطلب یہ ہوگا کہ قومی تکثیریت کی نمو کے باعث اخلاقیات تنگ تر ہو جائے گی اور عیسیٰ علیہ السلام کی عالمگیر اخلاقیات تہہ و بالا ہو جائے گی۔ روسو اور لوتھر جیسے لوگوں نے جس دانش ورانہ تحریک کا آغاز

کیا اس نے ایک اکائی کو توڑ کر بہت سی بے ترتیب کثرتوں کو جنم دے دیا اور ایک انسان کے انفرادی نظریے کو قومی نظریے میں تبدیل کر دیا۔ جسے زیادہ حیثیت پسندانہ اساس درکار تھی۔ جیسے ملک کا تصور، نظام سیاست کے مختلف النوع ضابطوں کے ذریعے اظہار، جن کی بنا قومی خطوط پر استوار ہو۔ یعنی ایسے خطوط جو جغرافیائی علاقے کو سیاسی استحکام کا واحد اصول تسلیم کرے''۔ [1]

اقبال مغرب کے اس نظریہ کو اہل اسلام کے لیے نہایت مہلک تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ مغرب کے اس تصور نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخوت پر مبنی فکر کو پارہ پارہ کر دیا تو یہ عالم اسلام کے لیے کیسے خوش آئند ہو سکتا ہے۔ اور جب انھوں نے ترکوں کے خلاف عرب ممالک کو انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کرتے دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ وطنیت اور قومیت کے مغربی تصورات مسلمانوں کے لیے انتہائی ضرر رساں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مغرب کے قومیت کے تصور کے برعکس ملت اسلامیہ کا تصور پیش کیا اور اپنی فکر سے ثابت کیا کہ مسلمانان عالم کے لیے بنیادی نظریات کی رو سے ایک وسیع تر ملت کا تصور ہی درست ہے اور قومیت کا مغربی تصور مسلمانوں کی تباہی کا باعث بنے گا۔

اقبال جانتے تھے کہ جغرافیائی وطنیت پر مبنی مغرب کا نظریہ نہ صرف انسانیت کش تھا بلکہ ملت کش بھی تھا اور یہ اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ مغرب کے ہاں وطنیت کا تصور ایک بت کی حیثیت رکھتا ہے اور اہل مغرب وطن پرستی میں بت پرستی کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اس حوالے سے ایک مغربی مفکر ایلڈس ہکسلے لکھتا ہے۔

''وطنیت ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت رکھتی ہے جس میں ریاست

---

[1] اقبال، تقریریں، تحریریں اور بیانات، ترجمہ، اقبال احمد صدیقی، اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۲۰، ۲۱

کا درجہ خدا کا سا ہے۔ یہ خدا بڑی قربانی کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کی پرستش کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کے اسفل جذبات یعنی دشمنی، نفرت اور انتقام وغیرہ کی تسکین بھی ہوتی ہے''۔ [1]

مغرب کی یہ بت پرستی انسان کو اخوت، محبت اور بھائی چارہ جیسے جذبات سے محروم کرتی ہے۔ اس سے انسانیت نہ صرف ٹکڑوں میں تقسیم ہوتی ہے بلکہ انسانی روایات بھی رخصت ہو جاتی ہیں۔ اقبال نے قیام یورپ کے دوران میں مغرب کی وطنیت وقومیت کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور ان پر یہ واضح ہو گیا کہ مغرب کی ملک گیری کی ہوس اور پسماندہ اقوام کے استحصال کی حکمت عملی نے نہ صرف مغربی اقوام میں مسابقت کی فضا پیدا کر دی ہے بلکہ ایک بڑی جنگ کے امکانات کو بھی نمایاں کر دیا ہے۔ اہل مغرب انسان دوستی اور احترام آدمیت جیسے بنیادی اوصاف سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس سیاسی معاشی اور تہذیبی برتری کے حصول میں مغربی اقوام ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو رہی ہیں۔ جس کے نتیجے میں سامراجیت کو فروغ اور کمزوروں کو مزید کمزور کیا جا رہا ہے۔

اقبال ان تمام قباحتوں کی بنیادی وجہ مغرب کی وطنیت کے حوالے سے بت پرستانہ سوچ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک وطن پرستی بت پرستی کی ہی شکل ہے۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''وطن پرستی ایک مادی شے کی پرستش سے عبارت ہے۔ اسلام کسی صورت میں بت پرستی کو گوارہ نہیں کر سکتا۔ بت پرستی کی تمام اقسام کے خلاف احتجاج کرنا ہمارا ابدی نصب العین ہے''۔ [2]

اقبال وطن کو اس طرح بت بنا کر پوجنے کے سخت خلاف ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ

---

[1] ہکسلے، ایلڈوس، اینڈز اینڈ مینز، چیٹ اینڈ وینڈس، لندن، ۱۹۵۷ء، ص ۹۷، ۹۸

[2] اقبال، شذرات اقبال، ترجمہ، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۸۳ء، ص ۸۳

اسلام کی عالمگیر روح کے سراسر خلاف ہے۔ اقبال اس بت کو توڑنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ ان کا تصور قومیت وطن سے نہیں بلکہ اشتراک ایمان سے وجود میں آتا ہے۔ اس سلسلے میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت ان کے پیش نظر ہے۔ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں کفار کے ساتھ تصفیہ کرنے کی بجائے ہجرت کو ترجیح دی۔ ہجرت کی بجائے اہل مکہ سے نسلی و وطنی اشتراک کی بنا پر ایک وحدت عربیہ بھی قائم کی جاسکتی تھی کہ کفار اسی طرح بت پرستی پر قائم رہیں اور مسلمان اپنے خدائے واحد پر ایمان رکھتے ہوئے اپنی عبادات و معاشرت میں منہمک رہیں۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کر کے اشتراک ایمان کی بنیاد پر مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک نئی ملت اور نظریاتی مملکت کا آغاز کیا۔

اس حوالے سے عزیز احمد وضاحت کرتے ہیں۔

> ''جغرافیائی وطن پرستی کی اس تردید کی پہلی بنیاد کلیتاً تمدن، تفکر اور تاریخ اسلام ہے اور اقبال نے واقعہ ہجرت سے یہ مراد لیا ہے کہ یہ دراصل ایک انسان کی جغرافیائی وطن سے علیحدگی ہے اور اصلی وطن انسانیت ہے جس میں اجتماعی پیمانہ دینی یا تمدن وحدت ہے نہ کہ وطنی وحدت''۔ [1]

بانگ درا کی نظم 'وطنیت' جس میں اقبال نے وطنیت کو بحیثیت سیاسی تصور کے موضوع سخن بنایا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے اپنے نظریات کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ اہمیت کے پیش نظر، اس نظم کو مکمل تحریر کیا جا رہا ہے۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

---

[1] عزیز احمد، پروفیسر، اقبال نئی تشکیل، گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۴۷

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دین نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے
ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے [1]

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۱۸۷

اقبال کا دور سرمایہ دارانہ استحصال اور سامراجی لوٹ مار کا دور ہے۔ مغربی استعمار بری طرح سے دنیائے اسلام کے درپے ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان خود اپنی داخلی پسماندگی اور انتشار کی وجہ سے عدم استحکام کا شکار ہیں۔ ایسے میں اقبال اسلام کے نظریۂ انسانیت کے انقلابی پیغام کو لے کر آگے بڑھتے ہیں، ان کی اسلامی قومیت کے نظریہ سے وابستگی کسی تعصب کی بنا پر نہیں ہے بلکہ وہ مشرق کے ساتھ مغرب کے بھی ہمدرد نظر آتے ہیں۔ وہ ان کے اقتصادی، سیاسی، نظریاتی اور تہذیبی مسائل کا حل اسلام کے عالمگیر انسانی اتحاد پر مبنی نظریہ میں تلاش کرتے ہیں۔

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر [1]

اقبال کے نزدیک بنی نوع انسان کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی بقا کا انحصار ملت اسلامیہ کے استحکام پر ہے۔ اقوام عالم کو امن وسلامتی کی نوید صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے جب وہ اپنے تمام تر فطری اور بشری امتیازات کو پس پشت ڈال دے۔ اور یہ صرف اسی صورت ممکن ہے جب دین اسلام کی روح کے مطابق اتحاد و انسانیت کی طرف رجوع کیا جائے۔ اقبال مغرب کے استبداد اور ظلم و ناانصافی کا علاج صرف اسلامی قومیت میں دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے مغربی نظریۂ وطنیت اور قومیت کے حوالے سے جن خدشات کا اظہار کیا تھا۔ وہ خدشات آج امریکہ اور یورپ کے تہذیبی و ثقافتی برتری کے احساس میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ آج جدید قومیت کا تصور اپنے باطن میں ایک نفسیاتی احساس لیے ہوئے ہے۔ آج ہر مغربی ملک اپنی قومیت کا احساس تفاخر لیے ہوئے چاہتا ہے کہ وہ آزادانہ طور پر ایک تہذیب اور جداگانہ سیاسی و معاشی نظام کا حامل ملک بن جائے۔ نتیجتاً مذہب اور اخلاق سے عاری سیاست کے علمبردار مغربی ممالک معاشی مسابقت کی دوڑ میں اس قدر آگے نکل چکے ہیں

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۲۹۴

کہ جہاں پر انسانیت کی بقا کے امکانات بالکل معدوم ہو گئے ہیں۔ نیو ورلڈ آرڈر اور مغرب کے سامراجی حربے عراق اور افغانستان میں انسانیت کشی کی نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ مسلمان ممالک سیاسی وتہذیبی اور اقتصادی طور پر عدم استحکام کا شکار ہو کر اپنی مرکزیت کو داؤ پر لگا چکے ہیں۔ آج مسلمان پسماندگی، انتشار، کم علمی اور عدم مرکزیت کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔

اقبال بہت پہلے مغربی قومیت کے تحفے، رنگ ونسل کے امتیازی عقیدے پر تنقید کرتے ہوئے کہہ چکے تھے کہ ملک یا جغرافیائی حدود پر مبنی قومیت کا عقیدہ عالمگیر اخوت کے نصب العین کا دشمن ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر نکلسن کو لکھتے ہیں:

> ''اسلام ہمیشہ رنگ ونسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے—— دراصل اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوع انسان سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کر دیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے میں ایک مسلمان اور ہمدرد بنی نوع انسان کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی نوع آدم کی نشو وارتقا ہے''۔ [1]

---

[1] اقبال، کلیات مکاتیب اقبال، (جلد دوم) مرتبہ، سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۶۵، ۱۶۶

اقبال کے نزدیک قومی تعصّبات اور اقوام میں تفریق ملل کی سوچ دراصل مغرب کے سیاسی نظام کی دین ہے۔ مغرب کا یہ سیاسی نظام کیونکہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اس لیے، اس سے کسی قسم کے خیر کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ نظام اتحاد عالم انسانی کے تصور ہی کو باطل ٹھہراتا ہے۔ اس کی مثال جنیوا کا پیغام جمعیت آدم ہے، جو رنگ ونسل کے اختلاف کی نفی کی بجائے اسے ہوا دیتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا مقصد عالم انسانی میں وحدت کا ظہور ہے۔ ایک طرف جنیوا کا پیغام ہے، جس میں اقوام اور ملل کو تقسیم کر دیا گیا ہے اور تعصب ونفرت کی بنا پر انہیں ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف مکہ کا عالمگیر اخوت اور مساوات پر مبنی پیغام ہے، جس میں امتیازات رنگ ونسل کو پس پشت ڈال کر انسانی تخلیق کے نئے امکانات پیدا کیے گئے ہیں۔ اقبال اس حوالے سے کہتے ہیں:

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم[1]

اس حوالے سے فکر اقبال میں وحدت آدم کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''جیسا کہ اقبال نے سمجھا کہ مغرب کے ذہن میں مختلف اقوام ہی کا تصور کارفرما رہا، متحدہ انسانیت کا تصور ان کے شعور میں کبھی نہ آسکا، نہ آسکتا ہے۔ چنانچہ وحدت آدم، ملت آدم اور جمعیت آدم کے لیے کائنات میں صرف ایک تصور ہے، اسلامی توحید، یعنی ایک خدا، ایک انسان، نتیجتاً

[1] اقبال، کلیات اقبال، اردو، ص ۵۷۰

ایک عالمی نظام تہذیب، حریت کے لیے بھی اخوت کے لیے بھی، مساوات کے لیے بھی یہ آفاقی اصول ایک قانون فطرت ہے، جس کے مطابق انسان کی تخلیق کی گئی''۔ [1]

اقبال کے مطابق اسلامی نظریۂ قومیت کی بنیاد توحید و رسالت پر ہے۔ اس کے نتیجے میں حریت و مساوات اور اخوت بنی آدم کے آفاقی اصول جنم لیتے ہیں۔ اسلام میں بیت اللہ کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اسی بنا پر ملت کا مرکز بھی بیت اللہ ہی قرار پاتا ہے نہ کہ اس کی تشکیل جغرافیائی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ ایک روحانی اور آفاقی مرکز کی بدولت اتحاد انسانیت اور عالمگیر اخوت و مساوات اور حریت و انصاف اس تہذیب کی بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اقبال اسلامی قومیت کے حوالے سے اپنے مقالے ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر میں وضاحت کرتے ہیں۔

''مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے نہ اشتراک وطن، نہ اشتراک اغراض اقتصادی، ہم لوگ اس برادری میں، جو رسالت مآب ﷺ نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کا معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے''۔ [2]

اسی بنا پر اقبال مغربی قومیت کے نظریہ کو رد کر کے اسلامی قومیت کی جدید توجیہ پیش کرتے ہیں جو آج کثیر تہذیبی قومی دنیا میں بھی قابل قبول ہے۔ اقبال کے نظریۂ قومیت کی

---

[1] عبدالمغنی، پروفیسر، تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ۔فکر اقبال کی روشنی میں، خدا بخش اورینٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۱ء، ص ۲۵

[2] اقبال، مقالاتِ اقبال (ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر) مرتبہ عبدالواحد معینی، آئینۂ ادب لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۹

بنیاد اسلام کے دوامی اور آفاقی اصول وحدت پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظریۂ قومیت مختلف اوطان میں بسنے والے اہل اسلام کو نظریاتی وحدت کی لڑی میں پرو دیتا ہے۔ اقبال رموز بے خودی میں ملت اسلامیہ کی اساس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جام ما ست
رومی و شامی گل اندامِ ما ست
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بومِ او بجز اسلام نیست
مسلم استی دل بہ اقلیمے مبند
گم مشو اندر جہانِ چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم
در دلِ او یاوہ گردد شام و روم
دل بدست آور کہ در پہنائے دل
می شود گم ایں سرائے آب و گل
عقدۂ قومیت، مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد[1]

---

[1] اقبال، کلیات اقبال، فارسی، ص ۱۲۳، ۱۲۴

اقبال دیکھ رہے تھے کہ عالم اسلام جو توحید، رسالت اور ایک کتاب کے حوالے سے اتحاد و یگانگت کی بے نظیر تاریخ رکھتا ہے۔ وہ مغربی استعمار اور وطنیت وقومیت کے ملحدانہ تصور کے زیر اثر، انتشار اور نفاق کی دلدل میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ اقبال مغربی استعمار کی اس سازش کا بھی بغور مشاہدہ کر رہے تھے، جس نے عربوں کو ترکوں کے خلاف برسرِ پیکار کر کے سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ اقبال اس خطرہ کو بہت پہلے سے بھانپ گئے تھے، وہ دیکھ رہے تھے کہ مغربی قومیت کا یہ ہتھیار مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے انتہائی موثر اور مہلک ہے۔ جلد ہی ان کے یہ خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ اس حوالے سے ۱۹۳۸ء میں اسلام اور قوم پرستی کے حوالے سے مولانا حسین احمد مدنی کے بیان کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''میں اس وقت سے قوم پرستی کے نظریے کو رد کر رہا ہوں جب یہ ہند اور عالم اسلام میں اتنا معروف نہ تھا۔ بالکل آغاز ہی میں یورپی مصنفین کی تحریروں سے یہ بات مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ یورپ کے سامراجی عزائم کو اس موثر ہتھیار کی اشد ضرورت ہے۔ قوم پرستی کے یورپی نظریے کا مسلم ممالک میں پرچار۔ تاکہ اسلام کے مذہبی اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔ اور یہ منصوبہ جنگ عظیم (اول) کے دوران کامیابی سے ہمکنار بھی ہوا''۔ [1]

اقبال کے خدشات کے عین مطابق نظریۂ قومیت نے عالم اسلام میں جو قیامت بپا کی۔ اس نظریہ نے وطن کو ایک معبود بنا دیا جس کی پرستش نے ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ عالم اسلام کو تیزی سے اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا یہ فتنہ، اقبال کو بہت دل گرفتہ کر رہا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ عفریت بہت سرعت سے، دینی عصبیت کے مقابلے میں صف آرا ہو رہا ہے۔

---

[1] اقبال، تقریریں، تحریریں اور بیانات، ترجمہ، اقبال احمد صدیقی، ص ۳۴۰، ۳۴۱

جس کے نتیجے میں اہل اسلام بھی دین کو سیاست سے جدا کر رہے ہیں۔ اقبال کے نزدیک یہ سب نا اہل حکمرانوں کی ذاتی اغراض اور بے بصیرت ملاؤں کی کم فہمی کا نتیجہ ہے۔ اقبال کہہ چکے تھے کہ مغرب میں سیاست کی دین سے جدائی، عیسایت کے رہبانیت پر مبنی فلسفہ کے نتیجے میں ہے جب کہ اس کے برعکس اسلام ریاست اور دین کی ہم آہنگی پر زور دیتا ہے۔ اس حوالے سے خطبہ الٰہ آباد میں وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''عیسایت کے ساتھ جو کچھ یورپ میں ہوا وہ قطعی طور پر قدرتی امر نظر آئے گا۔ یسوع مسیح کی آفاقی اخلاقیات کو اخلاقیات کے قومی ضابطوں اور نظام سیاست سے بدل دیا گیا۔ اس سبب سے یورپ کو جو نتیجہ اخذ کرنا پڑا وہ یہ تھا کہ مذہب ایک فرد کا نجی معاملہ ہے اور اسے اس چیز سے جسے دنیوی زندگی کا نام دیا جاتا ہے، کوئی سروکار نہیں۔ اسلام انسان کی یکتائی کو روح اور مادے کی ناسازگار دوئی میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں اللہ اور یہ کائنات روح اور مادہ، کلیسا اور ریاست ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں''۔ [1]

قومیت اور وطنیت کے اس مذہب سے عاری تصور نے اہل اسلام کو امتیاز رنگ ونسل کا اسیر بنا دیا ہے۔ اقبال اس طرزِ فکر وعمل سے بہت پریشان تھے۔ ان کے نزدیک اس سے اتحادِ عالم اسلامی کو نا قابل تلافی نقصان پہنچے گا اور اسلام کے عالمگیر انسانیت پرور مقاصد بھی حاصل نہیں ہوسکیں گے۔ اقبال 'جاوید نامہ' میں لکھتے ہیں:

در ضمیرِ ملت گیتی شکن
دیدہ ام آویزشِ دین و وطن

---

[1] اقبال، تقریریں، تحریریں اور بیانات، ترجمہ، اقبال احمد صدیقی، ص ۲۱

روح در تنِ مردہ از ضعف یقیں
ناامید از قوتِ دینِ مبیں
ترک و ایران و عرب مستِ فرنگ
ہر کسے را در گلو شستِ فرنگ
مشرق از سلطانیٔ مغرب خراب
اشتراک از دین و ملت بردہ تاب[1]

اقبال مغربی تصورِ قومیت اور وطنیت کی اس بنا پر مخالفت کرتے ہیں کہ اس کی بنیاد سیاسی تصور پر ہے اور اس کے مقابلے میں اقبال اسلام کے تصورِ قومیت کہ جس کی بنیاد مذہب اور اس کے عطا کردہ اخوت و مساوات کے جذبات پر ہے، کو فوقیت دیتے ہیں لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ ان کے ہاں وطن دوستی کا نظریہ سرے سے مفقود ہے۔ ان کی شاعری میں وطن دوستی کا والہانہ اظہار ہوا ہے۔ وطن کی جغرافیائی حیثیت سے نہ انھوں نے انکار کیا نہ ان کی محبت میں کبھی کمی آئی۔ اقبال کی بعد کی تصانیف، جیسے 'جاوید نامہ'، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق اور 'مثنوی مسافر' میں بھی وطن دوستی کے لطیف جذبات کا اظہار جا بجا ملتا ہے۔ ان کے نزدیک وطن سے غداری ایک خوفناک جرم ہے جسے کسی صورت معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کے وطن دوستی کے نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے طاہر فاروقی لکھتے ہیں:

''وطنیت کا وہ نظریہ جس کی تبلیغ سیاست مغرب کی طرف سے ہوئی ہے۔ آپ اس کے شدید مخالف ہیں اور اقوام و ملل کے حق میں اس کو سمِ قاتل خیال کرتے ہیں۔ لیکن وطنیت کا یہ مفہوم کہ ہندی، عراقی، خراسانی، افغانی، المانوی، فرانسوی، روسی، مصری وغیرہ ہونے کے اعتبار سے ہر فرد

---

[1] اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی، ص ۵۳۴

کو اپنے وطن ولادت سے تعلق اور نسبت ہے اور اسی لیے اس کو اپنے وطن کی خدمت کرنی چاہیے اور قربانیوں سے دریغ نہ کرنا چاہیے، اس کے آپ قائل اور معترف ہیں، ترانہ ہندی لکھنے کے وقت بھی آپ کی رائے یہی تھی اور مارچ ۱۹۳۸ء میں وفات سے ڈیڑھ مہینہ پہلے بھی ـــــ آپ کی رائے میں تغیر نہ ہوا تھا''۔ [1]

حقیقت میں اقبال نے مغربی وطنیت کے استرداد میں اسلامی وطنیت کی ایسی جدید وضاحت کی ہے جو آج بھی کثیر تہذیبی دنیا میں قابل قبول ہے۔ اقبال کا تصور وطنیت جو اسلام کے دائمی اصولوں پر بنیاد رکھتا ہے، کثیر الوطنی کو بھی رد نہیں کرتا۔ ان کے ہاں اوطان کی تکثیریت اسلامی نظریہ کی لڑی میں اس طرح پروئی گئی ہے کہ یہ ممالک اپنی علیحدہ سے شناخت رکھنے کے باوجود، اخوت ومحبت اور مذہبی رواداری کے قوام میں یک جان ہو سکتے ہیں۔ ویسے بھی اقبال عالم اسلام کے ایسے کسی اتحاد کے متمنی نہیں رہے کہ تمام عالم اسلام ایک حکمران یا خلیفہ کے زیر اثر آ جائے۔ وہ اس حوالے سے پر امید تھے کہ اسلامی ممالک اپنی آزاد اور خودمختار وحدتوں کو برقرار رکھتے ہوئے نسلی ولسانی رقابتوں کو ایک مشترک روحانی جذبے اور نصب العین کے تابع کر لیں گے۔ اس حوالے سے اپنے چھٹے خطبے 'الاجتہاد فی الاسلام' میں رقم طراز ہیں:

''عالم اسلامی کا ایک حقیقی اور موثر اتحاد ایسا آسان نہیں کہ محض ایک خلیفہ کے نمائشی تقرر سے وجود میں آ جائے۔ اس کا ظہور ہو گا تو آزاد اور خود مختار وحدتوں کی ایک ایسی کثرت میں جن کی نسلی رقابتوں کو ایک مشترک روحانی نصب العین نے توافق وتطابق سے بدل دیا ہو۔ میں تو کچھ یونہی دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ شاید ہم مسلمانوں کو بتدریج سمجھا

[1] طاہر فاروقی، پروفیسر، سیرت اقبال، ص ۴۱۳، ۴۱۴

رہی ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے، نہ شہنشاہیت بلکہ ایک انجمن اقوام جس نے ہمارے خود پیدا کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسلیم کیا ہے تو محض سہولت تعارف کے لیے۔ اس لیے نہیں کہ اس کے ارکان اپنا اجتماعی مطمحِ نظر محدود کر لیں''۔ [1]

مندرجہ بالا اقتباس اس حقیقت کا غماز ہے کہ اقبال کے نزدیک عالم اسلام کا اتحاد جغرافیائی اتصال پر نہیں بلکہ روحانی نصب العین کے اشتراک پر مبنی ہے لیکن ان کے مطابق جغرافیائی حدود کی پہچان کو دین و مذہب پر فوقیت دینا صریحاً خلاف اسلام ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب مغربی نظریۂ وطنیت کے زیر اثر عالم عرب میں، عرب قومیت کو اسلامی فکر کی بنیادی روح پر فوقیت دی گئی اور عرب سیاسی راہنماؤں، اساتذہ، دانشوروں اور طلبا نے برملا خود کو پہلے عرب اور پھر مسلمان قرار دیا تو اقبال نے اسے سخت ناپسند کیا۔ اقبال نے برملا کہا کہ یہ درست ہے کہ اہل وطن اپنے وطن کی خاک سے نسبت رکھنے کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں لیکن اس میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ قومیں وطن سے منسوب تو ضرور ہیں لیکن ان کی تشکیل وطن کی بنیاد پر نہیں بلکہ دین کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اپنی فارسی تصنیف 'جاوید نامہ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آں کف خاکے کہ نامیدی وطن
ایں کہ گوئی مصر و ایران و یمن
با وطن اہلِ وطن را نسبتے است
زانکہ از خاکش طلوعِ ملتے است
اندریں نسبت اگر داری نظر

---

[1] اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، ص ۲۴۶

نکتۂ بینی ز مو باریک تر
گرچہ از مشرق بر آید آفتاب
با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوزِ دروں
تا ز قیدِ شرق و غرب آید بروں
بردمد از مشرق خود جلوہ مست
تا ہمہ آفاق را آرد بدست
فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روئے نسبت خاوری است[1]

مغرب کا تقاضا ہے کہ وطنیت یا قومیت کو تسلیم کیا جائے اور ایک وطن سے اس درجے عقیدت اور محبت کی جائے کہ انسانیت سے محبت پس پشت چلی جائے۔ اسلام اس بات سے تو اتفاق کرتا ہے کہ وطن سے محبت کی جائے کیونکہ ہر شخص کو اپنے مرز بوم سے تعلق ہونا ایک فطری بات ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وطن کی محبت اور عقیدت کو ایک بت کا درجہ دے دیا جائے۔ وطن سے محبت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انسان وطن کی محبت میں باقی تمام دنیا کو حقیر اور کم تر خیال کرے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو مغربی وطنیت کا یہ تصور نہ صرف اسلام کے خلاف ہے بلکہ عالم انسانیت کو بھی ایک دوسرے سے ٹکرا دینے پر مصر ہے۔

اقبال وطن دوست ضرور ہیں لیکن وطنیت سے بیزار دکھائی دیتے ہیں اور اس تصور کو اسلامی روح کے منافی قرار دیتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کے اس اعتراض کو کہ اقبال وطن کے حوالے سے بنی نوعِ انسان کو ایک نظام اخوت کے ماتحت تولانا چاہتے ہیں لیکن وطن، جہاں سے انسان کا خمیر اٹھتا ہے، اس کی محبت اور درد کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کو مسترد کرتے

[1] اقبال، کلیات اقبال، فارسی، ص ۵۳۵، ۵۳۶

ہوئے عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں کہ اقبال کے ہاں وطن کے دو معنی ہیں یعنی گفتار سیاست، اور ارشاد نبوت، جہاں تک ارشاد نبوت کا تعلق ہے تو اقبال کا دل اس فطری جذبے سے خالی نہ تھا اور جس مٹی سے ان کا خمیر تیار ہوا تھا، نظریۂ آفاقیت کے قائم کرنے کے بعد بھی اس کا انس اور اس کا درد ان کے دل میں باقی رہا۔ لیکن یہ محبت جب سیاسی روپ اختیار کرتی ہے تو ہر قسم کے رشک و رقابت اور شر و فساد کا منبع بن جاتی ہے اور وطنیت کی محدود مادی دیوار حائل ہو کر نوع انسانی کو مختلف قوموں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ عزیز احمد، فکر اقبال کے ارتقائی مدارج میں وطنیت کے تصور کے بدلتے ہوئے رنگوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اقبال کی شاعری کی جذباتی سطح پر 'وطن' اور مذہب دونوں اپنی اپنی جگہ قائم رہے صرف سیاسیات نے ایک سے قطع تعلق کر کے دوسرے سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا''۔ [1]

اقبال کے تصور وطنیت کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی انھی خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ اقبال حب الوطنی کے لیے قربانی کو نفسیاتی اعتبار سے ناگزیر قرار دیتے ہیں، ان (اقبال) کے نزدیک وطن اور وطنیت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ وطن کا اسلامی تصور ایک مجرد تصور ہے جس میں حب الوطنی کا تعلق مذہب سے اور ملت اسلامیہ کے ثقافتی سرمائے سے ہے۔ وطن سے محبت اور مذہب سے محبت دونوں کے درمیان تصادم کی بجائے ہم آہنگی ان کے نزدیک صحیح لائحہ عمل ہے۔

عہد حاضر میں جب کہ وطن اور وطنی قومیت کا رجحان بہت نمایاں ہے تو ایسے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ فکر اقبال کی روشنی میں مختلف قومیتوں کے وجود کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں متحد کر دیا جائے۔ مختلف قومیتوں کو ان کے وجود کے احترام کے ساتھ متحد کرنے کا عالمگیر اور فطری نصب العین صرف دین اسلام کی دین ہے۔ اسلام میں نبوت محمدیہ ﷺ کی

---

[1] عزیز احمد، اقبال نئی تشکیل، ص ۵۲

غرض و غایت ہی یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی تمام اقوام کو ان کے نسلی و لسانی اختلافات کے باوجود انھیں وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو ہر زمان و مکاں میں ابدیت کا عنصر رکھتا ہو۔ یہی ملت اسلامیہ کا نصب العین ہے۔ جس سے مختلف قومیتیں اپنی علیحدہ سے شناخت رکھنے کے باوجود ایک دوسرے میں مدغم ہوسکتی ہیں۔ یوں نہ صرف عالم اسلام کے مختلف ممالک اپنی جغرافیائی حدود کو برقرار رکھتے ہوئے ایک روحانی اور اخلاقی اتحاد کی لڑی میں منسلک ہو سکتے ہیں بلکہ عالم اسلام کے ساتھ عالم مغرب کی اقوام بھی ایک دوسرے کی شناخت کو احترام دیتے ہوئے باہمی اتحاد کی راہیں نکال سکتی ہیں۔

یہ اسلامی نظریۂ وطنیت اور قومیت کا فیض ہے جو نہ صرف اسلامی ممالک کو یکجا کرتا ہے بلکہ عالم اسلام کے ساتھ مغرب کو بھی تمام تر فطری امتیازات برقرار رکھتے ہوئے اتحاد کی لڑی میں پرو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صدیق جاوید، اسلام کے عطا کردہ احترام انسانیت اور اقوام کے اس نظریہ کی وضاحت فکر اقبال کے تناظر میں یوں کرتے ہیں۔

> ''اقبال کے نزدیک نسل اور حدود ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم قابلِ اعتراض نہیں بشرطیکہ وہ مقصود بالذات نہ ہو ـــــ اقبال کے نزدیک نیشنلزم کی اصل اور صالح صورت یہ تھی کہ اپنے ملک اور وطن سے محبت کے ساتھ دوسری اقوام کا احترام کیا جائے اور ان کے اوطان کا تقدس پامال نہ کیا جائے اور ایک ملک کسی دوسرے ملک کو جارحیت کا شکار نہ کرے''۔ [1]

اتحاد عالم اسلامی کے حوالے سے اقبال کا نظریہ، دنیا میں جبراً اسلامی حکومت مسلط کرنا نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد اسلام کی آفاقی فکر اور روح کے حوالے سے اسلامی ممالک کو ایک ایسے مضبوط اور پائیدار رشتہ اخوت و اتحاد سے منسلک کرنا ہے جس کے ذریعے وہ ہر جارحیت

---

[1] صدیق جاوید، ڈاکٹر، اقبال۔ نئی تفہیم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۳۳۷

کے خلاف اپنا کامیاب دفاع کر سکیں۔

اقبال کی فکر کی بنیادی روح اس سلسلے میں یہی ہے کہ تمام اسلامی ممالک اپنی اپنی جغرافیائی حدود کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ایسی مشترکہ حکمت عملی ترتیب دیں۔ جو انھیں استعمار کی دست درازی اور غلط نگاہی سے مامون رکھ سکے۔ اقبال کے نزدیک اسلام ایک ازلی، ابدی، آفاقی اور عالمگیر نوعیت کا پیغام ہے جو ہر زمانے میں ہر قوم اور ملک کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے۔ اس کے پیروکار رنگ، نسل اور ملک و وطن کے امتیازات کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ اقبال سمجھتے ہیں کہ دنیائے انسانیت کے لیے عالمگیر برادری اور خاص طور پر عالم اسلام کو یکجا کرنا، اسلامی روح کا بنیادی تقاضا ہے۔

اقبال کے پیش کردہ وطنیت کے تصور اور جمال الدین افغانی کے پان اسلام ازم کے تصور میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک بھی ملت اسلامیہ کا اتحاد ان کی تمام تر جغرافیائی حدود کو برقرار رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ افغانی کی اتحاد عالم اسلامی کی تحریک کو یورپی اور روسی استعمار نے سخت ناپسند کیا اور اسے ایک ایسا اتحاد قرار دیا جو اقوام عالم اور خاص طور پر مغرب کے لیے تباہ کن ہوگا۔ اقبال اور افغانی کے تصور اتحاد عالم اسلامی میں مماثلت کے حوالے سے فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''اتحاد عالم اسلامی کے سلسلے میں افغانی اور اقبال کا مطمحِ نظر بالکل ایک جیسا ہے۔ افغانی کے اتحاد عالم اسلامی کا مقصد یہ تھا کہ تمام اسلامی حکومتوں کو اس طرح ہم خیال و ہم رشتہ کر دیا جائے کہ وہ متحدہ قوت کے ذریعے غیر ملکی اور لادینی تسلط سے چھٹکارہ حاصل کر سکیں۔ ان کا مقصود ہرگز یہ نہ تھا کہ سارے اسلامی ممالک کو ختم کر کے ایک بڑی اسلامی سلطنت قائم کر دی جائے یا مختلف اسلامی ممالک کے مسلمانوں سے ان کا

جذبہ حب الوطنی چھین کر ان پر حب دین کو بہ جبر مسلط کر دیا جائے''۔ [1]

ڈاکٹر جاوید اقبال اتحاد عالم اسلامی کی ممکنہ صورت کا تجزیہ اقبال کے تصور وطنیت و قومیت کے حوالے سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عالم اسلام کا اتحاد خواہ عالمگیر مثالی صورت میں جلوہ گر ہو یا اس کی صورت ایک وفاق کے انداز میں سامنے آئے، جس میں مسلم ریاستیں باہم یکجا ہو جائیں۔ یا اتحاد کی شکل آزاد ریاستوں کے درمیان مختلف معاشی و اقتصادی اور تمدنی وعسکری معاہدات کے انداز میں سامنے آئے، از حد ضروری ہے۔ اتحاد کی امکانی صورت کی وضاحت کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں کہ باہمی اتحاد کی پہلی صورت یعنی عالمگیر ریاست کا تصور آج کے زمانے میں محال ہے۔ جب کہ دوسری صورت وفاق ہے جو اس لیے نا قابل عمل ہے کہ ہر مسلم ملک میں مختلف سیاسی نظام رائج ہے۔ البتہ اتحاد کی تیسری صورت کہ تمام مسلم ممالک آزاد اور خود مختار رہتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ تمدنی، اقتصادی اور عسکری معاہدوں میں منسلک ہو جائیں۔ اقبال کے نقطۂ نگاہ کے مطابق اتحاد کی یہی آخری صورت قابل عمل ہے۔ کیونکہ اس طرح ہر مسلم ریاست اپنا جداگانہ تشخص برقرار رکھتے ہوئے دوسری مسلم ریاست سے اتحاد قائم کر سکتی ہے۔ یوں وقت گزرنے کے ساتھ مسلم ریاستوں کا یہ اتحاد انھیں ایک دوسرے کے مزید قریب لا سکتا ہے۔

اقبال اس حقیقت سے باخبر تھے کہ عالم اسلام ضرور متحد ہو گا اور اس کا اتحاد سیاسی یا جغرافیائی رنگ میں ضرور ظاہر ہو گا۔ اس بیداری کا احساس اہل مغرب میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس احساس کی بازگشت ٹائن بی کے ان خیالات میں واضح طور پر سنی جا سکتی ہے:

''ہر چند پان اسلام ازم محو خواب ہے تاہم اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ سونے والا بیدار بھی ہو سکتا ہے۔ اگر مغربی علوم میں تربیت یافتہ

---

[1] فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے، الوقار پبلی کیشنز، جوہر ٹاؤن، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۵

مسلمانوں نے مغربی بالا دستی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر دی اور مغرب مخالف جدید قیادت کے پیچھے صف بستہ ہو گئے تو پھر انقلابی اسلام نیند کو جھٹک کر بیدار ہو جائے گا اور ایک مرتبہ پھر دنیا میں اپنا تاریخی کردار سرانجام دینے لگے گا۔ یہ صورت حال دنیائے مغرب کے لیے انتہائی سنگین ہو جائے گی''۔ [1]

یقیناً ایسا ہی ہو گا کیونکہ اسلام نہ صرف عالم اسلام بلکہ نوع انسانی کی اقوام کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کرنے اور نسل وقومیت کے مصنوعی امتیازات مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بقول اقبال اسلام کی عظمت کا زمانہ ان شاء اللہ قریب آ رہا ہے۔ [2]

❑❑❑

---

[1] ٹائن بی، اسلام، دی ویسٹ اینڈ دی فیوچر، بحوالہ فتح محمد ملک، اقبال فراموشی، ص ۳۷

[2] اقبال، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، (جلد دوم)، مرتبہ: سید مظفر حسین برنی، ص ۳۸۱

باب پنجم

مغربی جمہوریت اور اقبال

مغربی جمہوریت کی ابتدا قدیم یونان کی شہری ریاستوں کے نظام سے ہوتی ہے۔ جہاں تمام آزاد شہریوں کی رائے سے ریاست کے معاملات کو طے کیا جاتا تھا۔ یہ قدیم نظام ایک تو چند شہروں تک محدود تھا۔ دوسرے اس میں غلاموں کو آزاد شہریوں کی طرح بنیادی حقوق حاصل نہیں تھے اور تیسرے یہ نظام جمہوریت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ البتہ جمہوریت کے ابتدائی خدوخال، جس کے مطابق نظام حکومت میں عام لوگوں کا عمل دخل ہونا چاہیے، اس دور میں ضرور مل جاتے ہیں۔

مغربی جمہوریت کے بنیادی خیالات کے ارتقائی سفر کے حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی تحریر کرتے ہیں:

> ''پانچویں صدی عیسوی میں رومن ایمپائر کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ یورپ کی تمدنی، سیاسی اور معاشی وحدت بالکل پارہ پارہ ہو گئی۔ یورپ بے شمار چھوٹے چھوٹے اجزا میں بٹ گیا اور نظام جاگیرداری (Feudal system) کا آغاز ہوا۔ کلیسا نے نوخیز نظام جاگیرداری سے موافقت کر لی (اور اس کا پشت پناہ بن گیا۔ یہ گویا ملوکیت کی نئی شکل تھی) پھر نشاتِ ثانیہ (Renaissance) کی ہمہ گیر تحریک سے یہ جمود ٹوٹا۔ خیالات، معلومات اور ترقی یافتہ طریقوں سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ کلیسا اور جاگیرداری کے خلاف کشمکش شروع ہو گئی۔ ان دونوں کے خلاف قوم پرستی کا بت تراشا گیا۔ دین و سیاست میں تفریق پیدا ہوئی۔ اخلاقی اقدار کمزور ہو گئیں۔ زندگی کے ہر شعبے اور راہ عمل میں مکمل آزادی

کا پرچار ہونے لگا۔ یہ خیالات جدید جمہوریت کی بنیاد بنے''۔ [1]

مغربی جمہوریت کے جدید تصور کا بنیادی حوالہ، ابراہام لنکن کے اس قول میں تلاش کیا جا تا ہے کہ عوام کی حکومت عوام کے لیے اور عوام کے ذریعے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''جمہوریت کا عام ترین مفہوم جس پر سب متفق معلوم ہوتے ہیں، یہ ہے کہ رعایا پر کوئی فرد یا کوئی طبقہ اس کی مرضی کے خلاف حکومت نہ کرے۔ ابرہام لنکن کے قول کے مطابق حکومت عوام کی ہو اور عوام کے لیے ہو اور رفاع عامہ اس کا مقصود ہو۔ جمہوریت وہ نظام ہے جس میں اقتدار اعلیٰ نہ سلاطین کو حاصل ہو اور نہ امرا کے طبقے کو۔ حکومت کی باگ نہ جاگیرداروں اور زمینداروں کے ہاتھ میں ہو اور نہ سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کے ہاتھ میں۔ مجلس آئین ساز میں جو نمائندے ہوں وہ آزادی سے عوام کے منتخب کردہ اہل الرائے ہوں''۔ [2]

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں ہم مغربی جمہوریت کی اس شکل سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں، جو فکری اور نظری اعتبار سے متشکل ہوتی ہے۔ لیکن موجودہ مغربی جمہوریت کی عملی تصویر اس سے بالکل مختلف ہے۔ بظاہر تو یہ عوام کی حکومت ہے جو عوام کے ذریعے ہی وجود میں آتی ہے لیکن بباطن اس طرز حکومت میں اصل اقتدار کا مالک چند لوگوں پر مشتمل ایک گروہ ہو جاتا ہے، جو ملوکیت ہی کی ایک شکل ہے۔ اقبال کے نزدیک مغربی جمہوریت کی روح یعنی حریت فکر و عمل بحیثیت ایک اصول اسلام سے ہم آہنگ ہے لیکن ان اصولوں کی عملی شکل مغربی جمہوریت میں دکھائی نہیں دیتی، اسی لیے جدید مغربی جمہوریت بھی ملوکیت کا رُوپ

---

[1] رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اقبال کی طویل نظمیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۷

[2] خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، ص ۲۱۵

دھار چکی ہے۔عبدالسلام ندوی اس حوالے سے بجا لکھتے ہیں کہ:

''اس وقت یورپ میں جو جمہوری نظام حکومت قائم ہے وہ عملاً ملوکیت ہی کی ایک شکل ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ پہلے جو جبر واستبداد مطلق العنان بادشاہ کیا کرتے تھے، اب اسی کو جمہوری حکومتیں قومی بھیس بدل کر کر رہی ہیں''۔[1]

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری[2]

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کاروبار شہر یاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجود میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر[3]

---

[1] ندوی، عبدالسلام، اقبال کامل، الفیصل لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۲۲
[2] اقبال، کلیات اقبال اردو، ص ۲۹۰
[3] ایضاً، ص ۷۰۴

مغرب کا جدید جمہوری نظام، چنگیزیت، کی شکل اختیار کرتا ہے تو اقبال اس پر برملا تنقید کرتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری کے بقول:

''اقبال کے دور میں سب سے زیادہ نمایاں سیاسی نظام جمہوریت کا تھا لیکن ان کے نزدیک وہ بھی صرف ایک حجاب ہے قیصریت کی پردہ پوشی کا''۔ [1]

اقبال مغربی جمہوریت پر تنقید کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر مغربی جمہوریت کا ملوکیت کے روپ میں استبدادی نظام ہے۔ جس میں افراد کا ایک گروہ ذاتی اغراض و مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے عوام کے حقوق و مفادات کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ بنیادی حقوق انسانی، مساوات، بھائی چارے اور آزادیٔ خیال کے تمام دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

اس انداز حکمرانی کے ذریعے حکومت مخالف عناصر کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ہر قسم کے جبر و تشدد کو روا رکھا جاتا ہے۔ مغربی جمہوریت آج بھی ملوکیت اور سامراجیت کی بدترین مثال کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ امریکی جمہوریت اس کی تازہ ترین مثال ہے، جس نے جمہوریت کے نام پر، اقتدار کے لیے طاقت کا اندھا دھند اور منافقانہ استعمال 'نیو ورلڈ آرڈر' کا بنیادی اصول قرار دیا ہے۔ امریکی جمہوری نقطۂ نظر کے تحت بظاہر اقوام عالم میں تہذیبی تکثیریت اور تنوع کے فروغ کی حوصلہ افزائی ضروری ہے لیکن اقوام عالم کی یہ تہذیبی، مذہبی اور سیاسی آزادی، اس کی عسکری قوت اور غلبے کی خواہش کے سامنے بے بس دکھائی دیتی ہے۔ نوم چومسکی کے مطابق فی زمانہ امریکہ کی خواہشات کا احترام ہر ملک پر فرض ہے۔ وہی ملک امریکہ کا دوست کہلانے کا حقدار ہے جو ہر موڑ پر اس کی حمایت اور وفاداری کا دم بھرے۔ اس کے نزدیک امریکہ کی تمام تر پالیسیاں اور جمہوری اقدار کا مطمحِ نظر صرف اقوام عالم پر اس کی بالا دستی اور قومی مفادات ہیں۔ مغربی جمہوریت کے اس استعماری رخ کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام لکھتے ہیں:

---

[1] نوم چومسکی، انڈر سٹینڈنگ پاور، مرتبہ: مچل پیٹر + اسکوفل جون، پینگوئن بکس، نیو دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۵

''مغربی معاشروں میں فرد حکومتی نظام میں اپنی انفرادی حیثیت بہت حد تک کھو چکا ہے لہٰذا ان معاشروں میں فرد کے کردار کو نہیں بلکہ حکومت کے کردار کو دیکھنا چاہیے۔ مغربی طاقتور حکومتیں گذشتہ دو صدیوں سے کمزور اقوام کے استحصال میں سرگرم عمل ہیں۔ ان کے استعماری عزائم اور استحصالی جرائم بے پناہ ہیں۔ انھوں نے تہذیب کا صرف نقاب اوڑھ رکھا ہے ـــــ اگر صرف ویٹو کے استعمال کے تناظر میں ہی دیکھا جائے تو ان سپر طاقتوں کی جمہوریت، رواداری، حقوق انسانی کی پاسداری، آزادی، برادری اور برابری کے تمام دعوے انسانیت کے ساتھ مذاق ہیں۔ نیو ورلڈ آرڈر انسانیت کے ساتھ سب سے بڑا مذاق ہے، یہ جمہوریت کی مکمل نفی ہے''۔ [1]

اقبال مغربی جمہوریت پر تنقید کرتے ہیں تو ان کے سامنے، اس جمہوریت کے یہی تاریک پہلو ہیں۔ ان کی نظر میں مغربی جمہوریت ایک ایسا نظام ہے، جس کی باگ ڈور، اخوت و مساوات کی دسترس سے نکل کر مادہ پرستی کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ اس طرح یہ نظام بنی نوع انسان کی فلاح اور بہتری کے راستے سے ہٹ کر خالصتاً مادی اغراض و مقاصد کا حامل ہو گیا ہے۔ اس نظام میں انسانی ہمدردی اور اخوت و مساوات کے پہلو کو مکمل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور سلطانیٔ جمہور کے نام پر ایک دیو بے زنجیر تباہی و بربادی کا بازار گرم کیے ہوئے ہے۔ 'گلشن راز جدید' میں لکھتے ہیں:

فرنگ آئین جمہوری نہاد ست
رسن از گردن دیوے کشاد است

---

[1] محمد اکرم، اکرام، ڈاکٹر، اقبال اور ملّی تشخیص، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۷۸، ۲۷۹

زمن دہ اہل مغرب را پیامے
کہ جمہوراست تیغ بے نیامے
چہ شمشیرے کہ جانہامی ستاند
تمیز مسلم و کافر ندا ند
نہ ماند در غلاف خود زمانے
برد جان خود و جان جہانے [1]

مغربی جمہوریت کی دین، جھوٹ اور منافقت برسراقتدار طبقے کا سب سے موثر ہتھیار ہے۔ جس کی مدد سے وہ نہ صرف اپنا اقتدار برقرار رکھتے ہیں بلکہ عوام کو بھی بے وقوف بنا کر اصل مسائل سے توجہ ہٹائے رکھتے ہیں۔ اکثریت کا یہ ظالمانہ کھیل اپنے رائے دہندہ کو سرمایہ دار کے ہاتھوں میں کھلونا بنا دیتا ہے۔ ارکان حکومت محض زیادہ ووٹ حاصل کرنے کی وجہ سے اختیار کا حق حاصل کر لیتے ہیں، ضروری نہیں کہ ان میں کوئی قابلیت یا لیاقت بھی ہو۔ مغربی جمہوریت کے اس انداز انتخاب پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خان لکھتے ہیں:

> ''اکثریت کا فیصلہ جو اخلاق کے خلاف ہو محض اس لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ زیادہ تعداد اس کے موافق ہے۔ جمہوریت کا بڑا عیب جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ وہ شمار کرنا تو جانتی ہے لیکن وزن کرنا نہیں جانتی جس کے بغیر ہیت اجتماعیہ میں عدل و اعتدال قائم نہیں رہ سکتا''۔ [2]

---

[1] اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص ۴۵۰

[2] یوسف حسین خان، ڈاکٹر، روح اقبال، ص ۳۰۵

اقبال ضربِ کلیم میں جمہوریت کی تعریف یوں کرتے ہیں:

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے [1]

اقبال مغربی جمہوریت کو اس لیے بھی ناپسند کرتے ہیں کہ اس نظام نے انسانی اخوت اور عالمگیر بھائی چارے کے اعلیٰ نصب العین کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہے۔ جب کہ ایک اعلیٰ نظامِ حکومت کی بنیادی خوبیوں میں سے ایک خوبی اخوت و مساوات اور بھائی چارے کا حصول ہوا کرتا ہے۔ مغربی جمہوریت، اخوت و مساوات تو کیا پروان چڑھاتی، یہ تو نسلی تعصب کو ختم کر کے قومیت کے محدود دائرے سے نہ نکال سکی۔ اس کے برعکس اس کے طفیل متعصّبانہ قوم پرستی کو رواج حاصل ہوا، اس کے نتیجے میں کمزور قوموں پر عرصہ حیات تنگ ہوتا چلا گیا۔ اس سلسلے میں کہیں صنعت و تجارت کو ذریعہ بنایا گیا تو کہیں تہذیب کی روشنی پھیلانے کا پر فریب جال بچھایا گیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دھونس دھاندلی اور ہر قسم کے تشدد اور قوت کے استعمال کو بھی جائز سمجھا گیا۔ مغربی جمہوریت کے ساتھ ساتھ متعصّبانہ قوم پرستی بھی ترقی کرتی گئی۔ حکمت و صناعی اور تجارت نے ایک قوم کو دوسری اقوام سے قوی تر کرنے میں دوسروں پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کی اور صناعی اور تجارت بھی ایک طرح کی قذاقی ہو کر رہ گئی۔ مغربی جمہوریت کے اس غیر انسانی انداز پر اقبال نے بھرپور تنقید کی ہے اور کوشش کی ہے کہ جمہوریت کے حوالے سے نئی توجیح پیش کریں۔ مغربی جمہوریت کے ردعمل میں پیدا ہونے والی فکر اقبال کی وضاحت کرتے ہوئے یوسف حسین خان لکھتے ہیں:

---

[1] اقبال، کلیات اقبال اردو، ص ۶۶۰، ۶۶۱

''اقبال کی یہ خواہش تھی کہ سیاسی جمہوریت کی نئی توجیح پیش کی جائے اور اس کو بامعنی بنایا جائے تاکہ آزادی اور انصاف کے اخلاقی اصول سے انسانی زندگی مستفید ہو سکے۔ محض رائے شماری کی جمہوریت، زندگی کے مقاصد میں بنیادی تبدیلی کیے بغیر عدل و مساوات نہیں قائم کر سکتی''۔ [1]

اقبال مغربی جمہوریت کو نظام جنگ زرگری سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال کے اس خیال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس نظام میں صرف سرمایہ دار ہی کامیاب ہو سکتے ہیں، جو انتخاب کے موقع پر کھلے ہاتھوں روپیہ خرچ کر سکتے ہیں۔ اس نظام کے تحت عوام کی رائے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس رائے کو محض چند روپوں سے خریدا جا سکتا ہے۔ پیسے سے خریدے گئے منصب کو سرمایہ دار اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ عوام کی فلاح و بہبود کے نعرے محض نعرے رہ جاتے ہیں اور ان کی خدمت کے دعوے، منصب و اقتدار کی ہوس میں اپنی حقیقت کھو بیٹھتے ہیں۔ مغرب کا یہ جمہوری نظام عوام الناس کے لیے محض رنگ و بُو کا ایک قفس ثابت ہوتا ہے۔ 'خضر راہ' میں کہتے ہیں:۔

گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس ، الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو [2]

مغربی جمہوریت کی قباحتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے عبدالحمید کمالی اقبال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اقوام مغرب میں جمہوریت کا نام ہی نام ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے

---

[1] یوسف حسین خان، ڈاکٹر، روح اقبال، ص ۳۰۷

[2] اقبال، کلیات اقبال اردو، ص ۲۹۱

تحت وہاں عوام اس طرح پس رہے ہیں کہ آزادی، حریت اور خودی و غیرت کا ان میں خاتمہ ہو گیا ہے۔ محض چند رسمی اداروں کے قیام سے جمہوریت نہیں آ جاتی۔ خود ارادیت ایک طرز حیات ہے جو حیات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے''۔ [1]

اقبال کے نزدیک مغربی جمہوریت کی سرمایہ دارانہ سوچ اور اس کے زیر اثر ذہنی غلامی کے ردعمل میں بے قید آزادی اور لا دین جمہوری اقدار نے جنم لیا ہے۔ مغرب نے جدید جمہوری اقدار کی بات تو کی لیکن وہ اس کی روشنی میں اپنا سفر آگے نہ بڑھا سکا۔ کیونکہ اس کے پاؤں مادیت اور غرض مندانہ سرمایہ داری کی زنجیر نے جکڑ لیے تھے۔ یوں مغرب اپنی تمام تر روشنیوں اور تجلیات کے باوجود اپنی زندگی کی شب تاریک کو سحر نہ کر سکا۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاؤں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا [2]

مغربی جمہوریت کی سوغات، بے قید آزادی اور لا دین اقدار کا منطقی انجام اخلاقی باختگی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ آج مغرب کو بھی اس اخلاقی انحطاط کے سیل منہ زور کا سامنا ہے۔ مغربی مفکرین اس حوالے سے واضح فکر مندی ظاہر کر چکے ہیں۔ ہنٹنگٹن لکھتا ہے:

---

[1] عبدالحمید کمالی، اقبال اور اساسی اسلامی وجدان، مرتبہ، ڈاکٹر وحید عشرت، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۲۷۶

[2] اقبال، کلیات اقبال اردو، ص ۵۸۳

''معاشیات اور آبادیات سے کہیں زیادہ اہم مغرب میں اخلاقی انحطاط، ثقافتی خودکشی اور سیاسی نفاق کے مسائل ہیں۔ اخلاقی انحطاط کی جن علامات کی اکثر نشاندہی کی جاتی ہے ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

۱۔سماج دشمن رویے میں اضافہ جیسے جرائم، منشیات کا استعمال اور عام تشدد کا رجحان؛

۲-خاندان کی ٹوٹ پھوٹ جن میں طلاق کی شرحوں، ناجائز بچوں کی پیدائش، نوعمر لڑکیوں کا حاملہ ہونا اور صرف باپ یا صرف ماں پر مشتمل خاندانوں میں اضافہ شامل ہے؛

۳-کم از کم امریکہ میں 'سماجی سرمائے' میں کمی یعنی رضا کار انجمنوں کی رکنیت اور ایسی رکنیت سے وابستہ باہمی اعتماد میں کمی؛

۴-'اخلاقیات کار' میں عمومی طور پر کمزوری اور ذاتی عیش وعشرت کے رجحان کا بڑھنا؛

۵-علم وحکمت سے وابستگی میں کمی جس کا اظہار امریکہ میں علمی کارناموں کی کمتر سطحوں سے ہوتا ہے؛

مغرب کی آئندہ صحت اور دوسرے معاشروں پر اس کے اثر ورسوخ کا دارومدار خاصی حد تک ان رجحانات سے کامیابی سے نمٹنے پر ہے۔ جو بلاشبہ مسلمانوں اور ایشیائیوں کی جانب سے اخلاقی برتری کے دعوؤں کا سبب بنتے ہیں''۔ [1]

مغرب میں مغربی تہذیب اور جمہوریت کی عطا کردہ لادینیت اور بے اعتدالی سے جو

---

[1] ہنٹنگٹن، سیموئیل پی، *Clash of Civilizations*، ترجمہ سہیل انجم، تہذیبوں کا تصادم، ص۳۸۰،۳۸۱

خدشات سر اٹھا رہے ہیں، ان کی طرف مغربی مفکرین تو آج اشارہ کر رہے ہیں جب کہ اقبال مغربی تہذیب کی اس تباہی و بربادی کا تذکرہ بہت پہلے کر چکے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ آزادیٔ فکر اور آزادیٔ رائے مغربی جمہوریت کے دلکش 'تحائف' تو ہیں لیکن ان کا حد اعتدال سے بڑھا ہوا انداز معاشرے میں بے اعتدالی کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ ان کے نزدیک مغرب کی بے اعتدال آزادیٔ افکار بجائے منزل آشنا کرنے کے منزل سے بھٹکانے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ ان کے خیال میں آزادیٔ افکار اس وقت تک 'ابلیس کی ایجاد' ہے۔ جب تک اس کا سینہ جبریل امین کا نشیمن نہ ہو۔

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ [1]

جہاں تک جمہوریت کا ایک نظام حکومت کی حیثیت سے تعلق ہے تو، اقبال کی نظر میں جمہوریت ایک پسندیدہ نظام حکومت ہے۔ لیکن وہ جمہوریت کے اس تصور کو ناپسند کرتے ہیں جو مغرب نے پیش کیا ہے۔ کیونکہ اس تصور کی بنیاد جمہوری اقدار سے زیادہ سرمایہ دارانہ انداز میں پنہاں ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمام خرابیاں اس نظام میں پائی جاتی ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیات ہیں۔ اقبال جب مغربی جمہوریت پر تنقید کرتے ہیں تو حقیقت میں وہ اس نظام میں اصلاح کی تمنا کرتے ہیں۔ ان کے تصور میں اس ملوکانہ جمہوریت کے برعکس ایک حقیقی اور روحانی جمہوریت کا خاکہ تھا۔

بقول ڈاکٹر جاوید اقبال، اقبال نے جہاں کہیں بھی جمہوریت پر تنقید کی ہے، وہ حقیقی جمہوریت یا جمہوریت کی حقیقی روح پر نہیں کی بلکہ مغربی جمہوریت کی چنگیزیت اور ملوکانہ

---

[1] اقبال، کلیات اقبال اردو، ص ۵۸۹

روپ پر کی ہے، جمہوری حکومت پر ان کے اعتراضات خالصتاً اخلاقی و اصولی اور منصفانہ حیثیت اور نوعیت کے ہیں۔ اقبال کے نزدیک ایسی جمہوریت جو مذہب اور اخلاق کی بنیادی تعلیمات سے محروم ہو وہاں سرمایہ دارانہ ذہنیت عوام کا استحصال کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ وہ اسلامی ریاستوں میں ایسی جدید جمہوریتوں کے خواہش مند ہیں جن میں مذہب اور اخلاق کو کلیدی حیثیت حاصل ہو۔ خلیفہ وقت اور عام آدمی میں کوئی امتیازی فرق روا نہ ہو۔ ان کی تصوراتی جمہوری سلطنت میں مذہب اور ریاست میں علیحدگی کسی صورت بھی قابل قبول نہیں ہے۔

اقبال کی نظر میں اسلامی یا روحانی جمہوریت ہی ایک مکمل اور صحیح نظام حکومت ہے۔ ایسا نظام حکومت ہی ان کے ہاں حقیقی جمہوری نظام کہلانے کا حقدار ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اقبال کے تصور جمہوریت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس کے ذہن میں جمہوریت کا وہ نقشہ ہے جسے اسلام نے کچھ عرصے تک دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس جمہوریت میں حکمرانوں کا کوئی طبقہ نہ تھا، ہر طرح کی آزادیٔ ضمیر تھی۔ مملکت رفاہی تھی جس کے اندر عمر فاروقؓ جیسا جلیل القدر انسان راتوں کو گردش کر کے دیکھتا تھا کہ کہیں ظلم تو نہیں ہو رہا ہے یا کسی غریب کے گھر میں فاقہ تو نہیں۔ اگر کوئی غریب گھرانا نا ن شبینہ کا محتاج دکھائی دیا تو بیت المال سے اپنی پیٹھ پر لاد کر سامان خورو نوش معذرت کے ساتھ وہاں پہنچا دیا۔ اگر کسی امیر یا گورنر نے کسی غریب ذمی پر بھی ذرہ بھر ظلم کیا تو عمرؓ کے درے اس پر برسر عام برس گئے۔ یہ تھی مساوات حقوق اور عوام کی حکومت عوام کے لیے''۔ [1]

اسلامی اور مغربی جمہوریت میں بنیادی فرق حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کی تفویض کا ہے۔

---

[1] خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، ص ۱۲۹

اسلامی جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے۔ جب کہ مغرب میں اس کا سرچشمہ عوام کو قرار دیا گیا ہے۔ اقبال کو مغربی جمہوریت کے حوالے سے یہی بنیادی اعتراض تھا کہ مغربی جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ، اکثریت کے استبداد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی جمہوریت 'چنگیز سے تاریک تر' بن گئی ہے۔ اقبال دیکھ رہے تھے کہ یہ جمہوریت جو ابتدا میں آزادیٔ خیال، انسانی مساوات اور بھائی چارے کی علمبردار تھی، رفتہ رفتہ ملوکیت و سامراجیت کی بھیانک شکل اختیار کر گئی۔ یہ تمام قباحتیں، مغربی جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ کے صحیح تعین نہ ہونے کی بنا پر وجود میں آئی ہیں۔ اسی بنا پر اقبال اقتدار اعلیٰ کے حوالے سے واضح موقف اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''بطور اساس ریاست اسلام ہی وہ عملی ذریعہ ہے جس سے ہم اس مقصد میں کہ توحید کا یہ اصول ہماری حیات عقلی اور جذباتی میں ایک زندہ عنصر کی حیثیت اختیار کر لے، کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس اصول کا تقاضا ہے کہ ہم صرف اللہ کی اطاعت کریں، نہ کہ ملوک و سلاطین کی۔ پھر چونکہ ذات الٰہیہ ہی فی الحقیقت روحانی اساس ہے زندگی کی، لہٰذا اللہ کی اطاعت فطرتِ صحیحہ کی اطاعت ہے۔ اسلام کے نزدیک حیات کی یہ روحانی اساس ایک قائم و دائم وجود ہے''۔ [1]

مغربی جمہوریت کے حوالے سے اقتدار اعلیٰ کا نظریہ بالکل برعکس انداز اختیار کیے ہوئے ہے۔ مغرب میں اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ عوام ہیں اور عوام کے تفویض کردہ نمائندے اور ان کی مجلس قانون ساز، تمام تر اختیارات کی مالک ہے۔ مجلس قانون ساز کے یہ نمائندے ہر طرح کی قانون سازی کا حق رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں مذہبی و اخلاقی اقدار و روایات کو بھی مکمل رَد کیا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک ہر وہ قانون جس کی تصدیق قوم نے بذات خود نہ کی ہو

---

[1] اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، ص ۲۲۷

باطل ہے اور قانون کہلانے کا حقدار ہی نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس مادر پدر آزادی کے طفیل مغربی قانون ساز اداروں نے ایسی ایسی قانون سازی کی، جس نے انسانیت کو شرم سار کر دیا۔ ان کے نزدیک کثرت رائے ہی کو حق حاصل ہے کہ وہ کسی فعل کے اخلاقی وغیر اخلاقی ہونے کا تعین کرے۔ نتیجتاً مغربی قانون ساز اداروں میں ایسے ایسے قوانین منظور ہوئے، جن کی بنا پر انسانیت منہ چھپانے پر مجبور ہو گئی ہے۔ ہم جنسی جیسے غیر فطری اور غیر اخلاقی فعل کو محض اس بنا پر قابل قبول بنا لیا گیا کہ منتخب ارکان نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اب اس رسوائے زمانہ فعل کو نہ صرف قانونی تحفظ حاصل ہے بلکہ اسے ایک عام معاشرتی قدر بھی قرار دے دیا گیا ہے۔

یہ شاخسانہ ہے، اس تصور کا جس کی رو سے عوام کو اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے میں اکثریت کے فیصلے ہی قابل قبول ہوں گے۔ اکثریت کی اہلیت اور قابلیت جیسی ہوگی، نتائج بھی ویسے ہی سامنے آئیں گے۔ ان سے یہ غلطیاں دانستہ و نادانستہ ہر دو انداز میں ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اگر اپنے ضمیر اور اخلاقی تقاضوں کے مطابق کام بھی کرنا چاہیں گے تو وہ اکثریت کے استبداد کے سامنے بے بس ہوں گے۔ اس کے برعکس اسلامی جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہونے کے سبب، تمام تر قوانین، قرآن وسنت کی حقیقی روح کے مطابق بنائے جائیں گے۔ ایسے میں تمام منتخب ارکان اسمبلی ایک متعین فریم ورک کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر سکتے ہیں۔ یہاں مادر پدر آزادی کا تصور بھی ناپید ہے۔

اسلامی جمہوریت کے تحت کسی نمائندے یا حکومت کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ محض اکثریت کی بنیاد پر اعلیٰ انسانی اقدار کو بدل کر رکھ سکے۔ اسلامی نمائندوں اور حکومت کا کام ہے کہ وہ فرمانِ الٰہیہ کی روشنی میں جدید تقاضوں کے تحت اسلامی اخلاقی اصول وضوابط کی پاسداری کرتے ہوئے قانون بنائے اور اس پر عمل درآمد کرائے۔

اقبال اسلامی جمہوریت کی روح ایسے آئین کو قرار دیتے ہیں۔ جس کی بنیاد عین قرآن ہو۔ اس حوالے سے رموزِ بے خودی کے یہ اشعار قابل توجہ ہیں:

ملتے را رفت چوں آئین زدست
مثل خاک اجزائے او ازہم شکست
ہستیٔ مسلم ز آئین است و بس
باطن دین نبی ﷺ این است و بس
نغمہ از ضبط صدا پیدا ستے
ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستے
تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست
زیر گردوں سرّ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرف او را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
می برد پابند و آزاد آورد
صید بنداں را بفریاد آورد
نوع انساں را پیام آخریں
حاملِ او رحمۃ للعالمینؐ
اے گرفتار رسوم ایمان تو
شیوہ ہائے کافری زندان تو

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن [1]

مغرب میں انسان مادہ پرستی کے زیر اثر ایک مشین کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس بنا پر اس کے جذبات و احساسات کے اظہار کا کوئی موقع نہیں ہے۔ نتیجتاً نفسیاتی ردعمل کے طور پر انفرادیت پرستی کے رجحان نے عفریت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ انسانی زندگی کا بنیادی مقصد ہی انفرادی سطح پر زیادہ سے زیادہ نمایاں ہونا قرار پایا ہے۔ رہی سہی کسر مغربی جمہوری نظام نے پوری کر دی۔ جس کی رو سے ہر فرد اپنی خواہشات کی تکمیل میں مکمل آزادی کا مالک ہے۔ اس سلسلے میں فرد کی مسرت کا معیار جنسی اور مادی خواہشات سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔ نتیجتاً روحانی اقدار اور اخلاقیات کو اس نظام سے دیس نکالا دے دیا گیا ہے۔

مغربی جمہوریت کے برعکس اسلام نے انفرادی زندگی کی اہمیت کے پیش نظر، انسانی مسرت اور خوشی کا راز خود غرضی اور ہوس پرستی کی بجائے انسانیت کی بھلائی سے وابستہ کیا ہے۔ اسلام کے مطابق انفرادی زندگی کے حق کا یہ مطلب نہیں کہ فرد معاشرے کے دیگر ارکان کے جذبات کو پس پشت ڈال دے۔ اسلام میں فرد پر زور دیا گیا ہے کہ وہ احترام آدمیت کے جذبے کے ماتحت اپنی ذات کو تمام انسانیت سے وابستہ کر لے۔

اقبال کا تصور خودی، اس سلسلے میں نہ صرف فرد کی انفرادی تربیت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے بلکہ اسے تمام انسانیت سے وابستہ کر کے نوع انسانی کو بھی فلاح و بقا کا دوامی پیغام دیتا ہے۔ اقبال تصور خودی کے ذریعے مسلمان سے تو مخاطب ہیں ہی لیکن ان کی فکر سارے جہاں کے درد سے لبریز ہے، ان کی محبت تمام نوع بشر پر محیط ہے اور ان کا پیام تمام نوع انسانیت کے لیے ہے۔ اقبال خودی کی تربیت کے ذریعے نہ صرف اپنی ملی روایات کی حفاظت کی

---

[1] اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳

جانب متوجہ ہیں بلکہ ان کا تخاطب بلا امتیاز مذہب وملت تمام نوع انسانی سے ہے۔

اقبال، اسلامی جمہوریت میں ہر شخص کو آزادی اور حریت و مساوات کی نعمت سے فیض یاب دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر فرد کی خودی بیدار ہو کر اسے اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنی آزادی کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو بلکہ معاشرے کے دیگر افراد کی آزادی اور آزادیٔ فکر کا احترام کرے۔ اسلام کے مطابق ہر شخص کی آزادی کی حدود، دوسرے شخص کی آزادی کی حدود تک دراز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی جمہوریت میں انفرادی آزادی کا تصور مغربی جمہوریت میں دی جانے والی انفرادی آزادی کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام میں آزادی کے ساتھ احساس ذمہ داری کا عنصر نتھی کر دیا گیا ہے۔ یہ احساس ذمہ داری ہی ہے جو اختیارات اور قوت کے ناجائز استعمال سے باز رکھتا ہے۔ اور اسی ذمہ داری کے احساس سے بیگانگی افراد کو طاقت کے ناجائز استعمال، استحصال، بدعنوانی، عیش وعشرت اور جنسی بے راہروی جیسے رذائل میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اقبال اسی بنا پر جہاں خودی کی ترویج کر کے فرد کی انفرادی صلاحیتوں کو بڑھانے کی تعلیم دیتے ہیں، وہاں احساس ذمہ داری کا سلیقہ پیدا کرنے کے لیے خودی کو اجتماعی خودی کے تابع کرنے کا درس بھی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ، اقبال کے تصور خودی اور بے خودی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''خودی کی ایسی صورت جو اپنے علاوہ دوسرے انسانوں کو نظر انداز کرے وہ تخریب اور بگاڑ کی ایک شکل ہے۔ لہٰذا انسانی تجربے نے بتایا کہ خودی کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہم رنگ قسم کی خودی (شعور) سے متحد ہو جاتی ہے۔ یہاں سے ایک اجتماعی خودی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح افراد کا شعور ایک جزو ہوتا ہے، اسی طرح اجتماعی خودی کا شعور بھی انفرادی خودی کی مانند ہم رنگ کے ساتھ

شیرازہ بند ہوتا ہے۔اس اجتماعی خودی کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوا کہ خودی کا یہ شعور ہر وقت برقرار رہے کیونکہ اس کا احساس خود اس کی ذات تک محدود نہیں بلکہ اس کی حدیں اس کے قلب سے ماورا دوسرے انسانوں کے قلوب اور ان کے شعور تک پہنچتی ہیں۔ یہ شعور انفرادی خودی کے لیے لازمی ہے۔لیکن اس کے لیے کسی آئین کی ضرورت ہے جس پر عمل کرنے سے اجتماعی خودی محفوظ رہ سکے۔کسی آئین کے بغیر اجتماعی خودی پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور اس کے اجزا یوں بکھر جاتے ہیں کہ فرد کی خودی بھی شدید طور پر متاثر ہوتی ہے اور اس میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے''۔ [1]

گویا انفرادی خودی، اجتماعی خودی سے متصادم نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل میں معاون ہیں۔فرد اپنی انفرادی خودی کے ارتقا اور استحکام کے بعد ملت کا ایک بیش قیمت سرمایہ بن جاتا ہے اور ملت اپنے آئین اور قوانین کو فرد پر لاگو کر کے اس کی خودی کو تعمیری اور تخلیقی حدود کا پابند رکھتی ہے۔ یہی وہ حقیقی ربط ہے۔ جو فرد اور ملت کے درمیان موجود ہو تو حقیقی روحانی جمہوریت کے ثمرات معاشرے پر ارزاں ہوتے ہیں۔اقبال 'رُموز بے خودی' میں لکھتے ہیں:

فرد را ربط جماعت رحمت است
جوہر او را کمال از ملت است
ناتوانی با جماعت یار باش
رونق ہنگامۂ احرار باش

---

[1] عبداللہ، ڈاکٹر، طیف اقبال، ص ۶۱، ۶۲

حرز جاں کن گفتۂ خیرا لبشرؐ
ہست شیطاں از جماعت دور تر
فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند
سلک و گوہر، کہکشاں و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
مایہ دار سیرت دیرینہ او
رفتہ و آئندہ را آئینہ او[1]

اقبال کے نزدیک ایک صحیح نظام حکومت کے تمام تقاضے اگر کوئی نظام پورے کر سکتا ہے تو وہ صرف اسلامی نظام ہے۔ دنیا میں صرف اسلام نے ایک ایسا نظام نافذ کر کے دکھایا جہاں جمہوریت اپنی مکمل روح کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ جہاں معاشی اور معاشرتی مساوات، بنیادی ضروریات کی فراہمی، حریت فکر اور آزادیٔ ضمیر، رفاہی مملکت کا قیام اور رنگ و نسل سے بالا تری ہو۔ اسلامی نظامِ حکومت میں حاکموں کا عوام کی مرضی سے منتخب ہونا اور عوام کے سامنے جوابدہ ہونا اور اسی قسم کے تمام جمہوری تقاضوں کی ضمانت موجود تھی۔ اسی لیے اقبال کے خیال میں جمہوریت کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ صرف اسلام نے نافذ کیا ہے۔ اس کے سوا دنیا کا کوئی اور نظام تا حال ایسا نہیں کر سکا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فی زمانہ اس اسلامی جمہوریت کا رنگ انھیں مشرق و مغرب میں کہیں نظر نہیں آتا۔

---

[1] اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص ۹۹

اقبال ایک ایسے نظام حکومت کے خواہش مند ہیں، جسے انھوں نے روحانی جمہوریت بھی کہا ہے۔ جو تمام دنیا کے لیے مثال بن سکے۔ اس کی حیثیت ایک مینارۂ نور کی ہو جس سے تمام دنیا روشنی اور رہنمائی حاصل کر لے۔ اس طرح ایک عالمگیر بھائی چارہ اور اخوت و مساوات کی بنیاد رکھی جا سکے۔ یہ بنیاد ہی دراصل عالم انسانیت کو ازلی مخالفتوں اور دشمنیوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ اقبال ساری دنیا کو ایک عالمگیر برادری کی شکل میں امن و سکون کی زندگی گزارتے ہوئے دیکھنے کے تمنائی ہیں۔ لیکن اس کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک قومی، نسلی اور علاقائی تعصّبات اور خود غرضانہ مفادات سے اقوام عالم دستکش نہ ہو جائیں۔ ایسا کرنے کے لیے دنیا کو انتہائی منصفانہ اور عادلانہ نظام کی ضرورت ہے اور یہ نظام بلا شبہ، صرف اسلامی جمہوریت ہی کی شکل میں موجود ہے۔

اقبال، مشرق و مغرب کے تمام نظام ہائے حکومت، جس میں مغربی جمہوریت سرفہرست ہے، سے مایوس ہیں۔ وہ اسلامی و روحانی جمہوریت میں ہی انسانیت کی فلاح اور انسانیت کے مسائل کا حل دیکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں زیر نظر اقتباس توجہ کا حامل ہے، جو ان کے چھٹے خطبے، 'الاجتہاد فی الاسلام' سے لیا گیا ہے:

> ''اس میں کوئی شک نہیں، جدید یورپ نے اسی نہج پر متعدد عینی نظامات قائم کیے لیکن تجربہ کہتا ہے کہ جس حق و صداقت کا انکشاف عقل محض کی وساطت سے ہو اس سے ایمان و یقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہوتی جو وحی و تنزیل کی بدولت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل محض نے انسان کو بہت کم متاثر کیا۔ برعکس اس کے مذہب کو دیکھیے تو اس نے افراد میں اضافۂ مراتب کے ساتھ، معاشروں تک کو بدل ڈالا۔ لہٰذا یورپ کے عینی فلسفہ کو کبھی یہ درجہ حاصل نہیں ہوا کہ زندگی کا کوئی موثر جزو بن سکے اور اس لیے اب حالت یہ ہے کہ یورپ کی فسادزدہ خودی باہم دیگر حریف

جمہوریتوں کی شکل میں، جن کا مقصد وحید ہی یہ ہے کہ دولت مندوں کی خاطر ناداروں کا حق چھینے، اپنے تقاضے پورے کر رہی ہے۔ یقین کیجئے یورپ سے بڑھ کر آج انسان کے اخلاقی ارتقا میں بڑی رکاوٹ اور کوئی نہیں''۔ [1]

مندرجہ بالا اقتباس میں اقبال مغرب کے عقل محض پر مبنی فلسفۂ زندگی اور نظام حکومت سے مایوسی کا اظہار کرنے کے بعد، انسانیت کے جملہ مسائل کا حل اور اس کے ارتقا کا راستہ صرف اسلامی و روحانی جمہوریت میں ہی دیکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے اسی خطبے سے اقتباس پیش خدمت ہے۔

''برعکس اس کے (مغربی نظام ہائے حکومت) مسلمانوں کے نزدیک ان بنیادی تصورات کی اساس چونکہ وحی و تنزیل پر ہے، جس کا صدور ہی زندگی کی انتہائی گہرائیوں سے ہوتا ہے، لہٰذا وہ اپنی ظاہری خارجیت کو ایک اندرونی حقیقت میں بدل دیتی ہے۔ ہمارے لیے تو زندگی کی روحانی اساس ایمان و یقین کا معاملہ ہے جس کی خاطر ایک غیر تعلیم یافتہ مسلمان بھی بہ رضا و رغبت، اپنی جان تک قربان کر دے گا۔ پھر اسلام کے اس بنیادی تصور کے پیش نظر کہ وحی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے، لہٰذا اب کوئی ایسی وحی نہیں کہ ہم اس کے مکلف ٹھہریں، ہماری جگہ دنیا کی ان قوموں میں ہونی چاہیے جو روحانی اعتبار سے سب سے زیادہ استخلاص حاصل کر چکی ہیں ـــــ ہمیں چاہیے کہ آج اس موقف کو سمجھیں اور اپنی حیات اجتماعیہ کی اَز سرِ نو تشکیل اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں کریں،

---

[1] اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، ص ۲۷۶

تا آنکہ اس کی وہ غرض و غایت جو ابھی تک صرف جزواً ہمارے سامنے آئی ہے، یعنی اس روحانی جمہوریت کا نشو ونما جو اس کا مقصود و منتہا ہے، تکمیل کو پہنچ سکے''۔ [1]

❑❑❑

[1] اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ، نذیر نیازی، ص ۲۷۶، ۲۷۷

کتابیات

۱- احسن، عبدالشکور، ڈاکٹر، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور، ۲۰۰۰ء،

۲- اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ: نذیر نیازی، بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۳ء

۳- اقبال، شذرات اقبال، ترجمہ، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۸۳ء

۴- اقبال، تقریریں، تحریریں اور بیانات، ترجمہ، اقبال احمد صدیقی، اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور، ۱۹۹۹ء

۵- اقبال، علم الاقتصاد، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۹۱ء

۶- اقبال، کلیات اقبال، اُردو، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۴ء

۷- اقبال، کلیات اقبال، فارسی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء

۸- اقبال، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، (جلد دوم)، مرتبہ: سید مظفر حسین برنی، ترتیب پبلشرز، لاہور، س-ن

۹- اقبال، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، (جلد چہارم)، مرتبہ: سید مظفر حسین برنی، اُردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۸ء

۱۰- اقبال، گفتار اقبال، مرتبہ، رفیق افضل، ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۱- اقبال، مقالات اقبال، عبدالواحد معینی، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۸۸ء

۱۲- اکرام، محمد اکرم، ڈاکٹر، اقبال اور ملّی تشخیص، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۸ء

۱۳- برنٹن، کرین/کرسٹوفر، جان بی/ وولف، رابرٹ، ایل، تاریخ تہذیب (حصہ اول) ترجمہ: غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۵ء-۱۹۷۶ء

۱۴- بریفالٹ، رابرٹ، تشکیلِ انسانیت ترجمہ: عبدالمجید سالک، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۴ء

۱۵- پرویز، غلام احمد، انسان نے کیا سوچا، طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور، ۱۹۹۶ء

۱۶- تحسین فراقی، ڈاکٹر، اقبال۔ چند نئے مباحث، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۷- حنیف رامے، اسلام کی روحانی قدریں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء

۱۸- خالدہ ادیب خانم، ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش، ترجمہ: ڈاکٹر عابد حسین، جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی، ۱۹۸۳ء

۱۹- خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، بزمِ اقبال،، لاہور، ۲۰۰۵ء

۲۰- ڈریپر، معرکۂ مذہب و سائنس، ترجمہ: ظفر علی خان، الفیصل لاہور، ۱۹۹۵ء

۲۱- راشد حمید، ڈاکٹر، اقبال کا تصور تاریخ، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۸ء

۲۲- رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اقبال کی طویل نظمیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

۲۳- سبط حسن، نویدِ فکر، مکتبہ دانیال کراچی، ۲۰۰۲ء

۲۴- سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی (مرتبہ) اقبال مشرق و مغرب کی نظر میں، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۲ء

۲۵- صدیق جاوید، ڈاکٹر، اقبال۔ نئی تفہیم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

۲۶- عابد حسین عابد/عبدالستار غوری (مؤلفین)، علامہ اقبال اور ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کا فلسفہ دید و نظر، ولی محمد ٹرسٹ، لاہور، ۲۰۰۵ء
۲۷- عبدالحمید صدیقی، پروفیسر، انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام، اسلامک پبلشنگ ہاؤس لاہور، ۱۹۷۶ء
۲۸- عبدالحمید کمالی، اقبال اور اساسی اسلامی وجدان، مرتبہ، ڈاکٹر وحید عشرت، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۷ء
۲۹- عبداللہ، ڈاکٹر، طیف اقبال، مرتبہ، ممتاز منگلوری، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۶ء
۳۰- عبداللہ، ڈاکٹر، سیّد، مقاماتِ اقبال، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۴ء
۳۱- عبدالمغنی، پروفیسر، تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ۔فکر اقبال کی روشنی میں، خدا بخش اورینٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۱ء
۳۲- عزیز الدین فقیر، روزگار فقیر، لائن آرٹ پریس، کراچی، ۱۹۶۸ء
۳۳- فاروقی، محمد طاہر، سیرت اقبال، گوہر پبلی کیشنز لاہور، س-ن
۳۴- فتح محمد ملک، اقبال فراموشی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء
۳۵- فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے، الوقار پبلی کیشنز، جوہر ٹاؤن، لاہور، ۲۰۰۴ء
۳۶- کنیز فاطمہ یوسف، ڈاکٹر، اقبال اور عصری مسائل، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء
۳۷- محمد آصف، ڈاکٹر، اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش (فکر اقبال کے تناظر میں)، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۹ء
۳۸- محمد عثمان، پروفیسر، اسرار و رموز پر ایک نظر، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء
۳۹- محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، تلاش اقبال، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۰۲ء
۴۰- محمود حسین، ڈاکٹر، معاہدۂ عمرانی (ترجمہ، سوشل کنٹریکٹ، لاہور)، مقتدری قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء
۴۱- ندوی، عبدالسلام، اقبال کامل، الفیصل، لاہور، ۲۰۰۸ء
۴۲- نذیر نیازی، سیّد، اقبال کے حضور، اقبال اکادمی، کراچی، ۱۹۷۱ء
۴۳- وحید قریشی، ڈاکٹر، اساسیاتِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۶ء
۴۴- ہنٹنگٹن، سیموئیل پی، تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیلِ نو، ترجمہ: سہیل انجم، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کراچی، ۲۰۰۳ء
۴۵- یوسف حسین خان، ڈاکٹر، روحِ اقبال، القمر انٹر پرائزز لاہور، ۱۹۹۶ء

1- *Encyclopedia Britanica*, (Vol. 20), University of Chicago, USA, 1980.
2- Noam Chomsky, *"Understanding Powers"* (Ed) by Mitchell, Peter R, and Scheoffel, John, Penguin Books, New Delhi, 2003.
3- Schimmel Annemarie, Prof. Dr., *"Gabriel's Wing"*, E.J. Brill, Leiden, Netherland, 1963.
4- Toynbee, Arnold, J. *"A Historical Approach to Religion"*, Oxford University Press, New Yark, 1956.